باب سوم

اسلام کا معاشرتی نظام

فصل اول	اسلامی معاشرہ: فکری اور نظریاتی مآخذ
فصل دوم	معاشرتی حقوق
فصل سوم	اسلام میں عورت کا مقام
فصل چہارم	غلامی کا تصور اور غلاموں کے حقوق
فصل پنجم	یتیموں اور بیواؤں کے حقوق
فصل ششم	اسلامی معاشرہ میں معذوروں کے حقوق
فصل ہفتم	معاشرتی ذمہ داریاں
فصل ہشتم	اسلام اور طبقات انسانی کا تصور
فصل نہم	معاشرتی عدل اور اس کے تقاضے

فصل اول

اسلامی معاشرہ: فکری اور نظریاتی ماٰخذ

انسانوں پر مشتمل وہ جماعت جو خاص قوانین، خاص آداب ورسوم اور خاص نظام کی حامل ہو اور انہی خصوصیات کے باعث ایک دوسرے سے منسلک اور ایک ساتھ زندگی گزارتی ہو معاشرہ تشکیل دیتی ہے۔ انسان کے علاوہ دوسرے جاندار بھی اجتماعی زندگی گزارتے ہیں اور اکھٹے رہتے ہیں، نظم وضبط کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ تاہم دوسرے جاندار معاشرتی زندگی تشکیل نہیں دے سکتے ہین اس لئے کہ انسان کی زندگی ایک اجتماعی ماہیت کی حامل ہے۔ ایک طرف تو اس کے مفادات، اس کے تعلقات اور اس کے کام کاج اجتماعی ماہیت رکھتے ہیں اور اپنے رسم و رواج کے دائرے میں تقسیم کار تقسیم مفادات اور ایک دوسرے کی مدد کے بغیر اس کا گزارہ نہیں، دوسری طرف کچھ ایسے افکار، نظریات اور مزاج بھی لوگوں پر حاکم ہیں جو انھیں وحدت ویگانگت بخشتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں معاشرہ انسانوں کے اس مجموعے کا نام ہے جو ضرورتوں کے جبری سلسلے اور عقائد ونظریات اور خواہشات کے زیر اثر ایک دوسرے میں مدغم ہوکر مشترک زندگی گزارتے ہیں۔

انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کن عوامل کے زیر اثر وجود میں آئی ؟ اس کے بارے میں تین قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ پہلا نظریہ انسان کے مدنی الطبع ہونے کا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان اجتماعی طبعیت لے کر پیدا ہوا ہے۔ انسان کی تخلیق طبعًا کل کے ایک حصے کے طور پر کی گئی ہے۔ اور اس کے وجود میں اپنے کل سے وابستہ ہونے کا رجحان موجود ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی اس فطری رجحان کا نتیجہ ہے۔ دوسرے نظریہ کے مطابق انسان کی تخلیق اجتماعی طبیعت پر نہیں ہوئی بلکہ بیرونی جبرواضطرار نے اسے اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ یعنی انسان نے اجتماعی زندگی طبعی اور فطری رجحانات کے زیر اثر نہیں بلکہ بیرونی خوف اور مجبوری کے تحت اختیار کی ہے۔ تیسرا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی فطری یا اضطراری نہیں بلکہ انسان اپنی عقل کے فیصلے اور محاسبے کی قوت سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ مشارکت، تعاون اور اجتماعی زندگی کے ذریعے ہی خلقت کے انعامات سے بہتر استفادہ کرسکتا ہے۔

پہلے نظریہ کے مطابق اجتماعی زندگی کا اصلی سبب انسان کی اندورنی طبعیت ہے۔ دوسرے نظریہ کے مطابق ایک بیرونی عنصر خوف و اضطراب اس میں کارفرما ہے اور تیسرے نظریئے کے مطابق اصلی سبب انسان کی عقلی قوت اور اس کی حساب کتاب کی صلاحیت ہے۔ (1)

---

(1) مطہری، آیت اللہ مرتضٰی، اسلامی تصور کائنات پر ایک تمہید، دفتر ثقافتی نمایندہ اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، ص ۴۰۴

قرآن کریم کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی اس کی طبعی اور فطری خلقت کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (1)

اے انسانو! ہم نے تمھاری تخلیق مرد اور عورت سے کی ہے اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے تا کہ تمہارے درمیان شناخت کی راہ نکل سکے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی زیادہ لائق تکریم ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

اس آیت کریمہ میں اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا جو بنیادی اصول بتایا گیا ہے وہ یہ کہ انسان کی اجتماعی زندگی اور اجتماعی روابط میں قبائل اور برادری کی تقسیم اور ایک دوسرے کی پہچان وشناخت ہی بنیادی عنصر ہے۔ یہ تقسیم جو ایک طرف وجہ اشتراک اور دوسری طرف وجہ افتراق ہے، اجتماعی زندگی کا جز لاینفک ہے۔ انسانوں کی قبیلوں اور برادریوں میں تقسیم اور رنگ وشکل اور قد پر مبنی اختلاف دراصل وہ پہچان اور شناخت فراہم کرتی ہے جس کے بغیر انسانی روابط، تبادلہ خیال، کام اور صنعتوں کے تبادلے کی بنیاد پر قائم انسان کی اجتماعی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (2)

اس آیت کریمہ میں انسان کی تخلیق اور اس کی فطری رجحان نسب وصہر کی وضاحت کی گئی ہے۔ جو انسان کی اجتماعی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے نسب وصہر افراد کو ایک دوسرے سے ملانے اور ان میں پہچان کی علامت بننے کا سبب ہیں اور یہ اصل خلقت کی مقصد کلی اور حکمت ہے۔

انسان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں ایک سبب نوع بشر کی ذہنی اور جسمانی تفاوت ہے۔ جس نے انسان کو ایک دوسرے کا محتاج بنایا ہے یہ تفاوت بھی انسان کی فطری تخلیق کے آثار ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (3)

کیا یہ لوگ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ (کیا خلق سے متعلق

---

(1) القرآن، ۴۹:۱۳ (1) ایضاً، ۲۵:۵۴ (3) ایضاً، ۴۳:۳۲

امور انہی کو سونپ دیے گئے ہیں کہ جسے چاہیں دیں اور جسے چاہیں نہ دیں) ہم نے (استعداد پر مبنی) وسائل اور ذرائع معاش کو دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان بانٹ دیا ہے اور بعض کو بعض پر برتری دی ہے تا کہ اس ذریعے بعض، بعض کو مسخر کریں اور یقیناً تیرے پروردگار کی رحمت اس چیز سے بہتر ہے جسے وہ جمع کر رہے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان سب کے سب یکساں صلاحیت اور یکساں وسائل کے ساتھ پیدا نہیں کیے گئے اور اگر ایسا ہوتا تو ہر کوئی وہی کچھ رکھتا جو دوسرے کے پاس ہے ہر کوئی اسی چیز سے محروم ہوتا جس سے دوسرا محروم ہوتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا کہ کوئی متوازی احتیاج، کوئی باہمی تعلق یا متبادل خدمت کی راہ نہ نکلتی۔ اللہ تعالیٰ نے نوع بشر کو صلاحیتوں، جسمانی، روحانی عقلی اور جذباتی وسائل کے اعتبار سے متنوع تخلیق کیا ہے۔ بعض کو بعض پر سبقت دی ہے۔ اس طرح سب کو بالطبع ایک دوسرے کا محتاج اور ایک دوسرے سے ربط باہم کا طلب گار بنادیا ہے۔ جس سے ایک مربوط اجتماعی زندگی کی بنیاد فراہم کی گئی ہے۔ مرد وزن کی تخلیق میں یہ اصول کارفرما ہے کہ مرد وزن طبعی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں جسمانی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں جس کی بناء پر زوجین میں ہر ایک میں آغاز خلقت سے ''کل'' سے ملحق ہونے کا رجحان موجود ہے اسی طرح تمام انسان طبعی طور پر اپنے ''کل'' یعنی اجتماعی زندگی میں شامل ہونے کا فطری رجحان رکھتے ہیں۔

قرآن مجید کی ان آیات مبارکہ کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انسان کی معاشرتی زندگی نری معاہداتی یا اضطراری و مسلط کردہ نہیں بلکہ فطری اور طبیعی ہے۔ انسانی خوف واضطرار عقل ومحاسبہ کی قوت کو معاشرتی زندگی میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

اجتماعی زندگی کا ایک اور پہلو معاشرہ اور افراد کی ترکیب سے متعلق ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعے سے مرکب ہے۔ افراد کے بغیر معاشرے کا تصور ناممکن ہے۔ معاشرے اور افراد کی ترکیب کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی اجتماعی زندگی میں بنیادی حیثیت فرد کی ہے یا معاشرہ کی؟ اس سلسلے میں فکری اور نظریاتی اختلاف موجود ہے۔ ضروری ہے کہ ان نظریات کا جائزہ لے کر معاشرہ اور فرد کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کی جائے۔

پہلا نظریہ فرد کی اہمیت کا حامل ہے جس کے مطابق معاشرے میں افراد کی ترکیب اعتباری ہے۔ یعنی حقیقت میں کوئی ترکیب عمل میں نہیں آئی۔ حقیقی ترکیب تو اس صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے جب کچھ امور ایک دوسرے پر اپنا رنگ جمائیں اور ایک دوسرے پر اثرات مرتب کریں۔ اثر گزاری اور اثر پذیری کا عمل ہو، عمل اور ردعمل کے نتیجے میں ایک نئی چیز اپنی خاص خوبیوں کے ساتھ وجود میں آئے۔ جس طرح آکسیجن اور ہائیڈروجن

کے خاص انداز سے ملنے اور کیمیائی عمل کے نتیجے میں پانی معرض وجود میں آتا ہے۔ پانی ایک بالکل نئی چیز ہوتی ہے۔ جس کی ماہیت بھی نئی اور خواص و آثار بھی اپنے ہی ہوتے ہیں۔ حقیقی مرکب کا لازمہ یہ ہے کہ اجزاء ایک دوسرے میں مدغم ہوکر اپنے خواص وآثار کھو دیں اور ''مرکب'' کے وجود میں حل ہو جائیں۔

انسان اپنی اجتماعی زندگی میں یوں ایک دوسرے کے ساتھ مدغم نہیں ہوتا اور لوگ معاشرے میں انسان الکل کی حیثیت سے حل نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ معاشرہ کوئی اصل، عینی اور حقیقی وجود نہیں رکھتا بلکہ اس کا وجود اعتباری اور انتزاعی ہوتا ہے۔ اصل، عینی اور حقیقی وجود رکھنے والی چیز صرف فرد ہے۔

دوسرے نظریے کے مطابق معاشرہ طبیعی مرکبات کی طرح حقیقی مرکب نہیں ہے تاہم صناعی مرکب ضرور ہے۔ صناعی مرکب اگر چہ طبعی نہیں ہے لیکن مرکب حقیقی کی ایک قسم ہے۔ اس کی مثال ایک مرتبط الاجزاء مشین کی سی ہے۔ جس میں اجزاء کی ہویت باقی رہتی ہے لیکن جداگا نہ اثر باقی نہیں رہتا۔ اجزاء ایک خاص ترکیب کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ اور ان کے اثرات بھی آپس میں پیوستگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جو علیحدہ حیثیت میں اجزاء کے مجموعی آثار نہیں ہوتے، مثلاً ایک گاڑی کے کل پرزے آپس میں ایک خاص ترکیب سے مربوط اور پیوست ہونے کی صورت میں مطلوبہ اثرات مرتب کرتے ہیں جبکہ جزوی طور پر گاڑی کے تمام پرزے ان اثرات سے عاری ہوتے ہیں۔

انسانی معاشرہ بھی بنیادی اور فروعی شعبوں اور پہلوؤں سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ شعبے اور وہ افراد جو ان شعبوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ سب ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے میں پیوستہ ہوتے ہیں۔ ثقافتی، مذہبی، اقتصادی، سیاسی، عدالتی یا تربیتی غرض جس شعبے میں بھی کوئی تغیر وتبدل ہوتا ہے، اس کا اثر دوسرے شعبوں پر پڑتا ہے۔ اجتماعی زندگی ایک گاڑی یا مشین کی طرح ہے جس میں معاشرہ کے افراد اپنی انفرادی ہویت برقرار رکھ کر اجتماعی اثرات مرتب کر لیتے ہیں۔

تیسرا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ معاشرہ طبیعی مرکبات جیسا ہی ایک حقیقی مرکب ہے۔ لیکن یہ قلبی تعلقات، افکار، عواطف، ارادوں اور چاہتوں کی ترکیب سے بنتا ہے یعنی یہ تمدنی ترکیب ہے۔ جسموں اور بدنوں کی ترکیب نہیں۔ جس طرح مادی عناصر ایک دوسرے پر اثرات قائم کرکے ایک نئی چیز ظہور میں لانے کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ مادے کے اجزاء ایک دوسرے میں اور ایک دوسرے پر تاثیر وتاثر، عمل اور ردعمل قائم کرکے ایک نئی شکل کی استعداد حاصل کر لیتے ہیں اور اسی ترتیب سے ایک نیا مرکب ظہور میں آتا ہے اسی طرح انسان بھی فطری اور عالم طبیعت سے حاصل کی ہوئی دولت کے ساتھ معاشرتی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور روحانی طور پر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ ایک جدید روحانی ہویت کے ساتھ اجتماعی حیات کی صورت پاتا ہے۔ یہ ترکیب اس اعتبار سے کہ ''کل'' اور مرکب ایک حقیقی اکائی کے عنوان سے وجود پذیر نہیں، یہ دیگر طبیعی مرکبات سے مختلف

ہے۔ لیکن اس اعتبار سے کہ اجزاء ایک دوسرے پر عینی اثرات مرتب کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے عینی تغیر کا سبب بنتے ہیں اور ایک نئی ہویت اختیار کرتے ہیں ایک طبیعی اور عینی ترکیب ہے۔

افراد اور معاشرے کی یہ ترکیب حقیقی اس لئے ہے کہ یہ اثرانداز ی اور اثر پذیری، عمل اور ردعمل واقعی رونما ہوتے ہیں اور اجزائے مرکب یعنی معاشرے کے افراد نئی صورت اور نئی ہویت سے ہمکنار ہوتے ہیں، لیکن کسی طور پر بھی کثرت وحدت میں نہیں بدلتی اور ایک حقیقی اکائی کے طور پر انسان الکل'' وجود میں نہیں آتا کہ کثرتیں اس میں حل ہو جائیں بلکہ انسان الکل'' ''افراد'' کا مجموعہ ہی ہوتا ہے جو اعتباری اور انتزاعی وجود رکھتا ہے۔

چوتھے نظریے کے مطابق معاشرہ طبیعی مرکبات سے بالا تر ایک حقیقی مرکب ہے، طبیعی مرکبات میں اجزاء ترکیب سے پہلے از خود ہویت وآثار کے حامل ہوتے ہیں اور ایک دوسرے میں اور ایک دوسرے پر تاثیر وتاثر، عمل اور ردعمل کے نتیجے میں نئی چیز کے پیدا ہونے کی بنیاد فراہم ہوتی ہے لیکن افراد اجتماعی وجود سے پہلے کے مرحلے میں انسانی ہویت کے حامل نہیں ہوتے بلکہ، خالی برتن ہوتے ہیں جن میں اجتماعی روح کے حصول کی استعداد موجود ہوتی ہے۔ اجتماعی وجود سے قطع نظر انسان، حیوان محض ہے اور اس میں صرف استعداد انسانیت موجود ہے۔ انسان کی انسانیت یعنی اس کی خودی، اس کا تفکر، اس کے عواطف واحساسات اس کے میلانات وحسیات اس کا فکری رجحان اور چاہت جو انسانیت سے متعلق ہوتی ہے، اجتماعی روح کے پرتو میں ابھرتی ہے۔ یہ اجتماعی روح جو ابتدا ہی سے اس خالی برتن کو پر کرتی ہے اور کسی شخص کو شخصیت عطا کرتی ہے اجتماعی روح ہمیشہ انسان کے ساتھ رہی ہے اور آئندہ بھی اخلاق، مذہب، سائنس، فلسفہ اور آرٹ کی صورت میں اس کے آثار ہمیشہ باقی رہیں گے۔ افراد کے ایک دوسرے پر روحانی اور معنوی اثرات کرنا، ایک دوسرے پر ایسا ہی عمل اور ردعمل اجتماعی روح کے ذریعے ہوتا ہے۔ درحقیقت انسان کی عمرانیات اس کی نفسانیات پر سبقت رکھتی ہے۔ (1)

پہلا اور دوسرا نظریہ انفرادی اصلیت پر مبنی ہے۔ جبکہ تیسرا نظریہ فرد اور معاشرہ دونوں کو اصالت دیتا ہے چوتھا نظریہ خالص اجتماعی اصلیت کا نظریہ ہے اس کے مطابق جو کچھ بھی ہے، اجتماعی روح، اجتماعی ضمیر، اجتماعی ارادہ، اجتماعی چاہت اور اجتماعی خودی ہی ہے انفرادی ضمیر، اجتماعی شعور وضمیر کا ایک مظہر ہے۔

قرآن مجید کی آیات مبارکہ سے تیسرے نظریے کی تائید ہوتی ہے۔ جس کے مطابق فرد اور معاشرہ کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک طرف قرآنی آیات میں فرد کو مخاطب کر کے معاشرہ کے اکائی طور پر تسلیم کیا ہے۔ دوسری طرف قرآن تمام امتوں (تمام معاشروں) کے لئے مشترک سرنوشت، مشترک نامہ عمل، فہم وشعور، عمل اور اطاعت وعصیان کا قائل ہے۔

---

(1) انفرادی نظریات کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ جبکہ اجتماعی نظریات پر اشتراکی اور اشتمالی معاشرے وجود میں آئے ہیں۔

قرآن اجتماعی حیات کا قائل ہے جو کہ محض ایک تشبیہ وتمثیل نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اجتماعی موت ایک حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (1)

ہر امت (ہر معاشرہ) کی ایک مدت معیار ہے، اسے موت سے ہمکنار ہونا ہے پس جب ان کا آخری وقت آتا ہے تو اس میں ایک گھڑی آگے ہوتی ہے اور نہ ایک گھڑی پیچھے۔

اس آیت میں ایک حیات اور ایک ایسی زندگی کی گفتگو ہے کہ جس کا ایک آخری لمحہ ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ایک گھڑی آگے نہ پیچھے، یہ حیات اور یہ موت افراد سے نہیں امت سے متعلق ہے۔ ابن خلدون بھی حیات اجتماعی کے متعلق لکھتے ہیں کہ انسانوں کی طرح سلطنتوں کی بھی عمریں طبعی ہوتی ہیں۔ (2)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا (3)

ہر امت اور ہر معاشرہ کو اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتاب کی سمت پڑتال کے لئے بلایا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف افراد کے اپنے مخصوص اعمال نامے اور کتابیں ہیں بلکہ معاشرے بھی اس اعتبار سے کہ زندہ، باشعور، مکلّف اور قابل خطاب ہیں، ارادہ واختیار بھی ان کے پاس ہے۔ نامہ اعمال رکھتے ہیں اور ہر معاشرہ نامہ عمل کی طرف بلایا جائے گا۔

اور ایک جگہ ارشاد فرماتے ہے۔

زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (4)

ہم نے ہر امت کے عمل کو ان کے لئے زینت بنا دیا ہے۔

یہ آیت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ ایک امت اپنا ایک شعور، اپنا ایک معیار اور اپنا طرز تفکر رکھتی ہے اس کا فہم وادراک خصوصیت کے ساتھ اس سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہر امت اپنے مخصوص معیار کے مطابق فیصلہ کرتی ہے۔ ہر امت کے ادراک کا ایک خاص ذوق اور سلیقہ ہوتا ہے بہت سے امور ایسے ہیں جو ایک معاشرہ کی نگاہ میں

---

(1) القرآن، ۷:۳۴ (2) ابن خلدون، مقدمہ، ص ۱۷۱۔

(3) القرآن، ۴۵: ۲۸ (4) القرآن ۶: ۱۰۸

اچھے اور دوسرے کی نگاہ میں برے ہوتے ہیں ہر امت ایک معاشرتی ماحول اور اس کی معاشرتی فضا ہے جو افراد کے ادراک سے متعلق سلیقے کو ایسا بناتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ ۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ(1)

اور ہر امت نے اپنے پیغمبر کو گرفتار کرنے کا عزم کیا اور ناحق اس سے جھگڑتے رہے تاکہ حق زائل ہوجائے اور جب انھوں نے ایسا کیا تو میں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ پس میرا عذاب کیسا رہا؟

اس آیت میں ایک ناشائستہ اجتماعی عزم وارادہ کے بارے میں معاشرتی رویئے کا اظہار ہے۔ جو کہ حق سے بے کار جھگڑے کے لئے اجتماعی ارادہ سے متعلق ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ اس نوعیت کے اجتماعی عزم وآہنگ کی سزا عمومی اور اجتماعی عذاب ہے۔ قرآن کریم میں بعض مقامات پر معاشرے کے فرد واحد کے کسی کام کو پورے معاشرے کے ساتھ نسبت دی گئی ہے۔ یا کسی نسل کے کسی عمل کو بعد کی نسلوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔(2)

یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب معاشرے کے افراد اجتماعی سوچ اور اجتماعی ارادہ رکھتے ہوں یعنی اجتماعی روح کے حامل ہوں۔ مثلاً قوم ثمود کے واقعہ میں حضرت صالحؑ کی اونٹنی کو کاٹنے کے عمل کو پوری قوم سے نسبت دی گئی ہے حالانکہ اسے کاٹنے والا ایک شخص تھا۔ قرآن کے الفاظ میں۔"فَعَقَرُوْهَا" (3) یعنی پوری قوم نے اس اونٹنی کو کاٹا۔ قرآن اس جرم میں پوری قوم کو شریک ورملوث جانتا ہے اور سب کو عذاب کا مستحق قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ (4)

پھر ان پر ان کے رب نے الٹ مارا۔

مختصر یہ کہ جب کوئی معاشرہ واحد سوچ اور واحد روح کا حامل ہوتا ہے تو ایک فرد جیسا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے افراد انسانی اعضائے وجود بن جاتے ہیں جو ذات اور عمل کے اعتبار سے انسان کی حیثیت میں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کی راحت اور تکلیف عیناً انسان کی راحت اور تکلیف بن جاتی ہے اور ان کی سعادت وشقاوت بھی عیناً

---

(1) القرآن، ۴۰: ۵ (2) القرآن، ۲:۷۹ اور ۳: ۱۱۲۔

(3) القرآن، ۹۱:۱۴ (4) ایضاً

انسان کی سعادت اور شقاوت قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ نے امت مسلمہ کو ایک جسد واحد سے تشبیہ دی ہے کہ مسلمان کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے، اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔(1)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے اجتماعی روح کی تمثیل یوں بیان کی ہے کہ مسلمان باہم مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کس طرح ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے۔ (2)

اسلامی معاشرہ دین اسلام کی اجتماعی روح کا مظہر ہے اسلامی معاشرہ افراد کے روحانی، قلبی تعلقات، افکار، عواطف، ارادوں اور چاہتوں کا حقیقی مرکب ہے۔ اسلامی معاشرہ مسلمانوں کی وہ ترکیب تمدن ہے جس میں افراد روحانی طور پر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک جدید روحانی ہویت کے ساتھ اجتماعی حیات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس اجتماعی حیات میں نوع بشر کے مختلف نسل، قبیلے اور معاشرے اس طرح وابستہ ہو جاتے ہیں کہ رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی اختلاف کے باوجود ایک جسد واحد کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ بشری معاشروں کا انضمام دین اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ بیسویں صدی کے مشہور مستشرق مینٹگمری واٹ (W. Montgomery Watt) لکھتے ہیں

> ''دنیا کے دوسرے بڑے مذہب کے مقابلے میں اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف لوگ اور قومیں جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان کے درمیان مضبوط بھائی چارے اور ہم آہنگی کا احساس دنشونما پا چکا ہوتا ہے۔''(3)

اسلامی معاشرے میں بھائی چارے اور ہم آہنگی کی جو فضا پائی جاتی ہے اس کی بنیاد وہ عقائد اور ایمانیات ہیں جو اسلامی معاشرہ کو فکری اور نظریاتی اساس فراہم کرتی ہے۔ عقائد میں عقیدہ توحید سرفہرست ہے۔ عقیدہ توحید نوع بشر کی وحدت کا ضامن ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جو فکری اور نظریاتی ہم آہنگی موجود ہے یہ عقیدہ توحید کی بدولت ہے اس لئے کہ تمام کائنات اور تمام انسانیت کا متبع مرجع ایک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ امت

---

(1) صحیح بخاری، کتاب الادب، ج ۲، ص ۲۶۰

(2) ایضاً، ص ۲۶۶

(3) Watt, W. M. Islam and the Integration of Society. London, Rutledge & Kegan Paul, P.1.

مسلمہ کے افراد میں ایک الہٰ کی تصور سے فکر ونظر کی وحدت پیدا ہوتی ہے۔عقیدہ رسالت اعمال صالحہ کو استحکام بخشتا ہے کیونکہ رسالت وہ ابدی پیغام ہے جو خالق کی طرف سے انسانوں کیلئے رشد وہدایت ہے، یہی ابدی پیغام اسلامی معاشرہ میں عبادات، معاملات اور اخلاقیات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،۔عقیدہ آخرت وہ قوت اور احساس ذمہ داری فراہم کرتی ہے کہ ایک مسلمان خلوت وجلوت میں معاشرتی حقوق اور ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتا ہے۔

عقائد اور ایمانیات کے بعد اسلامی تعلیمات کا دوسرا حصہ اعمال صالحہ پر مشتمل ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عقائد اور ایمانیات کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو صحیح جانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے۔ اعمال صالحہ ان اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی بنیادوں پر استوار ہونے والے اشکال ہیں۔ اس کے اندر انسانی اعمال خیر کے تمام جزئیات داخل ہے۔ تاہم اعمال صالحہ عبادات، معاملات، اور اخلاقیات میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

اسلام میں عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔ اس لئے اخلاق ومعاملات بھی اگر اس خوشی نیتی کے ساتھ کئے جائیں تو عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔ تاہم فقہاء کے نزدیک عبادت کا تعلق خاص اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ اخلاق انفرادی فرض اور ذمہ داری کا نام ہے جبکہ معاملات میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں عبادات کا بنیادی کردار ہے۔ عبادات، نماز،روزہ، زکوۃ،اور حج، معاشرتی زندگی میں تربیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ستر پوشی، طہارت اور پاکیزگی، پابندی وقت،صبح خیزی باہمی الفت ومحبت،نظم وضبط مساوات اور اطاعت جیسے انفرادی اور اجتماعی صفات اسلامی معاشرہ میں نماز کو قائم کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ روزہ سے خدا کی راہ میں ہرقسم کی جسمانی قربانی، اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت کی برادشت، خواہشات کی غلامی سے نجات اور قربانی وایثار کی تربیت ہوتی ہے۔ زکوۃ انسانوں کے درمیان ہمدردی اور ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے معاشی اور مالی امور اجتماعی زندگی کے لئے ناگزیر ہے زکوۃ اسلامی معاشرے میں معاشی درستگی اور اصلاح کا ذریعہ ہے۔ حج ملت ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل وتنظیم، مرکزی رشتہ، اتحاد کا قیام اور اس مرکز کی آبادی اورکسب روزی کے ذاتی کوشش اورمحنت کانام ہے۔

اخلاقیات میں اخلاق حسنہ یا فضائل، مثلاً صدق، سخاوت، عفت وپاکبازی، دیانت واری اور امانت داری،شرم وحیا،عہد کی پابندی، احسان،عفوورگزر، ایثار اور اعتدال، میانہ روی پرعمل پیرا ہونا ہے جبکہ معاملات میں قانون، عدالتی نظام، اجتماعی عدل وانصاف وغیرہ جیسے موضوعات آتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں انہی معاشرتی حقوق اور معاشرتی ذمہ داریوں پر بحث کی جائے گی۔

فصل دوم

معاشرتی حقوق

انسان کی اجتماعی زندگی حقوق وفرائض سے عبارت ہے۔ معاشرے کے افراد جب تک معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی حقوق وفرائض کی پاسداری کرتے ہیں تب تک معاشرہ میں اتحاد واتفاق اور ہم اہنگی موجود رہتی ہے لیکن جوں ہی معاشرتی ذمہ داریوں اور معاشرتی حقوق کی آدیگی میں ضعف آتا ہے تو پورا معاشرہ انتشار وافتراق کا شکار ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں حقوق وفرائض کی بجا آوری پر بہت زور دیا گیا ہے۔ معاشرہ کے ہر فرد پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری لازمی ہے۔ حقوق اللہ نماز، روزہ، زکوۃ اور حج پر مشتمل ہیں۔ جبکہ حقوق العباد کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں انسانوں کے علاوہ حیونات، نباتات، اور جمادات سب شامل ہیں۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق انسان کرۂ ارض پر خلیفہ اللہ ہے۔ جس کی وجہ سے انسان پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ تمام کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اور تمام کائنات میں اللہ تعالیٰ کا قانون جاری وساری ہے۔ انسان اعلیٰ وارفع مقام تب ہی حاصل کر سکتا ہے کہ وہ سنت الٰہی کی پیروی کرے۔ دوسری ذمہ داری انسان پر بحثیت خلیفہ اللہ یہ عائد ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ تمام کائنات کو انسان کیلئے مسخر کیا ہے۔ جمادات، نباتات، اور حیوانات انسان کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں اس لئے انسان کی ذمہ داری ہے کہ کائنات کے ان چیزوں سے وہی کام لیں جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ ان تمام اشیاء کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے اقدامات بھی کریں۔

اسلامی معاشرہ کی بنیاد اسی اصول پر رکھی گئی ہے کہ تمام انسان ایک آدمؑ کی اولاد ہیں پیدائش کے لحاظ سے، بحثیت انسان، ان میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے۔ ان سب کا ایک ہی گھرانا اور ایک ہی خاندان تھا۔ اب وہی خاندان پھیل کر تمام روئے زمین کو آباد کر گیا ہے اسی خاندان کی وسعت سے قبیلے اور قومیں بن گئی ہیں۔

اسلام کے معاشرتی تصورات میں انسانوں میں مختلف ذاتیں نہیں ہے وہ سب ایک ہیں وہ سب ایک نبی آدمؑ کے اولاد ہیں اور اسی حوالے سے انسانی برادری سے تعلق رکھتے ہیں ان میں رنگ، نسل، خون اور زبان یا علاقے کا کوئی امتیار نہیں ہے اس لئے سب یکساں معاشرتی، معاشی، سیاسی ور قانونی حقوق رکھتے ہیں۔ سب پر یکساں فرائض کی بجا آوری لازمی قرار دی گئی ہے۔

معاشرتی حقوق اجتماعی اور انفرادی خیرخواہی کے حصول کا نام ہے۔ باہمی تعلقات خیرخواہی کی بنیاد پر

استوار ہوتے ہیں جس سے معاشرے کے افراد میں اتحاد واتفاق اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور معاشرہ مضبوط دیوار کی طرح ''بنیان مرصوص' کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے معاشرے میں ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ. (1) کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کو پورے توازن کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پورے معاشرے اور اس کے اجتماعی اداروں کو مسلمانوں میں رحم، محبت اور درگزر جیسے صفات پیدا کرنے کے لئے متحرک کیا جاتا ہے۔ اس باہمی الفت ومحبت اور رحم ودرگزر پر مبنی معاشرتی حقوق کی آدائیگی سے معاشرے میں وہ استحکام پیدا ہوتا ہے کہ کسی کو اسلامی معاشرہ میں رخنہ اندازی کرنے کی ہمت اور کامیابی نہیں ہوتی ہے۔

معاشرتی حقوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ز وَلَا تُسْرِفُوْا (2)

اور ان کے مالوں میں سائل اور محروموں کا حق ہے۔

اور ان کے اموال میں سائل اور محروموں کا ایک مقررہ حق ہے۔

اور قرابت داروں، مساکین اور مسافروں کو اس کا حق دے۔

اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔

احادیث میں دوسرے بشری حقوق کے ساتھ یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ انسان پر اعضائے جسمانی کا بھی حق ہے نبی کریمؐ کا ارشاد فرماتے ہیں

بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔ (3)

تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔(4)

(1) القرآن، ۲۹:۴۸

(2) القرآن، ۱۹:۵۱۔ ۲۴:۷۰، ۲۵۔ ۲۶:۱۷۔ ۱۴۱:۶۔

(3) صحیح بخاری، ج ۲، کتاب الصوم، ص ۱۰۱۸

(4) صحیح بخاری، ج ۲، کتاب الصوم، ج ۲، ص ۱۰۱۷

تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ اور تیری ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

(1)

قرآنی آیات میں معاشرتی حقوق اور انسانی تعلیمات تدریجی ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہ تدریجی ترتیب معاشرتی حقوق کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اقتصادی حقوق میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ جس میں ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کیا ہے۔ ایک حیوان کے مقابلے میں ایک انسان کا حق، اجنبی شخص کے مقابلے میں ایک دوست کی مدد، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت داری ونزدیکی کی ترتیب رکھی گئی ہے۔ مگر یہ ترتیب امداد حق کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر کوئی عزیز باطل پر ہو۔ تو اس کے مقابلے میں غیر وبیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے۔ جو مدد محض قرابت اور عزیزداری کی بناء پر باطل شخص کو دی جاتی ہے اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں ''معصیت' ہے جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَمَنْ نَصَرَ قَوْمَهُ عَلَى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كَالْبَعِيرِ الَّذِي رُدِّيَ فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنَبِهِ(2)

عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا جس شخص نے اپنی قوم کی مدد ناحق پر کی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے اونٹ کنویں میں گر پڑا اور لوگ اس کی دم پکڑ گھسیٹیں۔

یعنی ناحق عزیز اور قرباء کے مدد مثال کی ایسی ہے جیسے ایک اونٹ کنویں میں گر رہا ہے اور لوگ اس کی دم پکڑے ہوئے ہوں۔ اس کا ایک مفہوم یہ ذہن میں آتا ہے کہ جولوگ ناحق دوسروں کی مدد کرتے ہیں وہ خود بھی ہلاکت اور تباہی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس طرح کی مدد سے اس شخص کو کوئی فائدہ نہیں مل سکتا۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں معاشرتی حقوق کی یہ ترتیب اور تفصیل نہیں ہے۔ انسان اور حیوان میں خط فاصل قائم نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً بدھ مت کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان برابر درجہ رکھتا ہے۔ اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی برابر کا درجہ پا سکتا ہے۔

یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کے برتر انہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے۔ اسلام نے معاشرتی حقوق کی پوری تفصیل تدریجی ترتیب کیساتھ بیان کی ہے۔ اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ

---

(1) صحیح بخاری، ج ۲، کتاب الصوم، ج ۲، ص ۱۰۱۶

(2) ابو داؤد سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، اردو ترجمہ وحید الزمان، ج ۳، کتاب العصبیۃ، ص ۶۶۶

یہ انسانوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد پر ہے یعنی انسان کا جس کے ساتھ اختیار زیادہ تعلق ہوتا ہے اتنا ہی اس کا درجہ بڑھ کر ہوتا ہے۔

معاشرتی حقوق کی یہ ترتیب قرآنی آیات میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَ قْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍفَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (1)

اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر و اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑسیوں کے ساتھ اور اجنبی ہمسایہ کے ساتھ، اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔

'' اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دو کہ تم جو خرچ کرو۔ وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں، اور مسافر کے لئے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ اس سے آگاہ ہے۔

''اور رشتہ دار حق ادا کرو اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کرو''

قرآنی آیات میں مذکور اس تدریجی ترتیب کی ضرورت ایک انسان کو اس وقت پیش آتی ہے جب بیک وقت ایک سے زائد افراد مدد اور خیر خواہی کے طلب گار ہوں جن میں والدین، عزیزا قرباء اور معاشرے کے دوسرے افراد شامل ہوں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ضرورت مند والدین یا عزیزواقارب کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کی مدد اور اعانت کرنا درست نہیں کیونکہ قرآنی آیات میں مذکورہ ترتیب کے ساتھ معاشرتی حقوق کی ادائیگی

---

(1) القرآن، ۴:۳۶۔ ۲:۲۱۵۔ ۱۷:۲۶

سے معاشرہ مستحکم ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ اسلامی معاشرہ میں خاندان ایک ابتدائی اکائی ہے۔ ابتدائی اکائی یعنی خاندان میں باہمی تعلق کی وابستگی اور پختگی معاشرتی استحکام کا پہلا قدم ہے۔ خاندان والدین، بہن، بھائیوں، میاں بیوی اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور والدین ہی خاندان کے اتحاد واتفاق، باہمی الفت ومحبت کے مظہر ہوتے ہیں۔

معاشرتی حقوق میں سب سے پہلا درجہ والدین کا ہے۔ والدین کی عزت، خدمت اور اطاعت حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہؐ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے۔ ان تعلیمات میں والدین کا درجہ اللہ تعالیٰ کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے۔ تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے۔

''تو اپنی ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس سرزمین پر جو خداوند خدا تیرا خدا تجھے دیتا ہے، دراز ہو''۔ (1)

''تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے''۔ (2)

'' اور جب کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے، مارا ڈالا جائے گا۔ جس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔(3)

اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے گا مارا ڈالا جائے گا۔ (4)

انجیل میں انہی احکامات کو دہرایا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کے روح ومعنی کا خیال رکھا جائے۔

''کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔ (5)

ہندو مذہب میں ماں باپ سے تعلقات ترک کرنا جاتی بھرنس'' جرم ہے یعنی وہ جرم جو مجرم اونچی ذات سے گراتے ہیں۔

اور گورو یا ماں باپ یا بیٹے کو ترک کرنا، ویدوں کے مطالعہ کا ترک کرنا۔۔۔۔۔۔۔۔ سب ایسے اعمال ہیں جو مجرم کو ذات سے گراتے

---

(1) عہد نامہ عتیق، خروج، ۱۲:۲۰ (2) ایضاً، احبار، ۳:۱۹

(3) ایضاً، احبار، ۳:۱۹ (4) ایضاً، خروج، ۱۷:۲۱ (5) عہد نامہ جدید، متی، ۴:۱۰

(یعنی جاتی بھرنس) کرتے ہیں'' اجاریہ بادھیہ سے دس گناہ باپ اجاریہ
سے سو گنا، لیکن ماں باپ سے بھی ہزار گنا کرتے ہیں'' زیادہ واجب
الاحترام ہے۔(1)

فطری طور پر بھی انسان ابتدائی تربیت والدین سے حاصل کرتا ہے۔ والدین کی تربیت سے انسان معاشرتی اقدار اور سماجی مراتب سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے بھی ہر شخص کے دل میں احترام والدین کا فطری جذبہ موجود ہوتا ہے۔

قرآنی آیات کے مطابق حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد میں انسان پر سب سے پہلا حق والدین کا ہے۔ والدین میں پھر ماں کا درجہ بلند ہے۔ عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی، وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکالیف برادشت کرنا، ماں کی بڑائی،عظمت، اس کی سب سے پہلے دلجوئی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ
فِيْ عَامَيْنِ (2)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی۔ اس کی ماں
نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس تک دودھ پلایا۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسانًا، حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا
وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا، وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (3)

اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے اس
کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے
ساتھ پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔

نبی کریمؐ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی ہے۔ ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون ؟فرمایا تیری ماں اس نے عرض کیا، پھر کون ؟ فرمایا تیری ماں تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا۔ چوتھی دفعہ پوچھنے

---

(1) منو،منو دھرم شاستر،باب ۱۱، ۶۰ تا ۶۸۔ باب ۲، ۱۴۴

(2) القرآن، ۳۱: ۱۴ (3) ایضاً، ۴۶: ۱۵

پر ارشاد فرمایا تیرا باپ(1) ایک دن نبی کریمؐ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے (2) ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی یا رسولاللہؐ: میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے،۔ کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ آپ نے فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں۔ دریافت کیا خالہ ہے؟ گزارش کی، ہاں فرمایا تو اس کے ساتھ نیکی کر (3) اور یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا، یارسول اللہ: میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ چاہتا ہوں فرمایا کیا تمھاری ماں ہے۔ جواب اثبات میں دیا تو فرمایا کہ تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔ (4)

ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید وتکوین میں شریک ہے وہ باپ ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں۔ اس لئے بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتا ہے اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی عزت کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کی خدمت ان کی اطاعت، ان کی مدد اور ان کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی اور یہاں تک تاکید کی ان کی کسی بات پر اف تک نہ کرو۔ ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو۔ انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے۔ بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔

قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ۱۲ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقوں پر تعلیم توحید اور خدا پرستی کے بعد ہی آئی ہے۔ اس لئے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعل اور دوسری علت مادی ہے۔ سب سے پہلی آیت سورۃ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف اشارہ بھی ہے، فرمایا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّااللّٰهَ ۙ
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (5)

---

(1) صحیح بخاری، کتاب الادب، ج۴، ص۲۴۴ (2) ایضاً

(3) امام ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، اردو ترجمہ مولانا بدیع الزمان نعمانی کتب خانہ اردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۶۶۶

(4) امام مسلم، صحیح المسلم، قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ کراچی، ۱۹۵۶ء ص۳۱۳

(5) القرآن، ۲:۳۸

اور ہم نے جب بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو اور ماں
باپ کے ساتھ نیکی کرو''۔

سورۃ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید جاتی ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (1)

اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ
کے ساتھ نیکی کرنا۔

اسلام سے پہلے لوگوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں رسمی وخیالی باتیں گڑھی تھیں۔ لیکن قرآن نے بتایا کہ حقیقت میں حرام خدا کے ساتھ شرک اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (2)

کہہ (اے پیغمبر) آؤ تمھیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر
کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے
ساتھ نیکی کرنا۔

اسلامی تعلیمات میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ان کے سامنے اُف بھی نہ کر اور عاجزی سے پیش آؤ ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ
عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْ
هُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ
الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (3)

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور
ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے

---

(1) القرآن، ۴:۳۶

(2) القرآن، ۶:۱۵۱ (3) ایضاً، ۱۷:۲۳، ۲۴

سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو اف بھی نہ کہو اور نہ ان سے خفا ہو اور
ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور
کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انھوں نے بچپن
میں مجھے پالا۔

شریعت محمدی میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی۔ اس کے باوجود اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اُٹھانا جائز نہیں ہاں اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کی دعوت قبول نہ کی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا(1)

ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کیساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کرو جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہنا نہ ماننا۔

بت پرست والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کی تاکید کی گئی ہے ارشاد ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ○ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (2)

''اور ہم نے انسان کو جتا دی کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اس کی ماں نے تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دوسال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گزران کر''

والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کا وطیرہ رہا ہے۔ حضرت ابراھیمؑ کے باپ اگر چہ مسلمان نہ تھے تاہم ابراھیمؑ نے خدا سے دعا مانگی۔

---

(1) القرآن، ۸:۲۹ (2) ایضاً، ۱۴:۳۱، ۱۵

رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ (1)

اے میرے پروردگار مجھے اور میرے باپ کو بخش دے۔

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ (2)

''میرے پرودگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے''

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا، حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا، وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا، حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً، قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ، اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَo اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَاعَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ، وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ(3)

'' اور ہم نے انسان کو تاکید کرکے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، اس کی ماں نے چونکہ اس کو تکلیف اٹھا کر پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور تیس مہینے تک دودھ چھڑانا، یہاں تک وہ بچہ سے جوان ہوا اور چالیس برس کا ہوا اور اس نے کہا میرے پرودگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا اور اس کا کہ میں وہ کام کروں جس کو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا، اور تیرے فرمانبرداروں میں سے ہوں یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے برے اعمال سے درگزر کرتے ہیں یہ جنت والوں میں ہوں گے اور یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔

---

(3) القرآن، ۴۶:۱۵، ۱۶ (3) القرآن، ۱۴:۴۱ (2) ایضاً، ۷۱:۲۸

احادیث میں نبی کریمؐ نے اس منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں سے ادا فرمایا ہے۔ کہیں فرمایا کہ ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ کبھی ارشاد ہوا۔ رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔ حسن معاشرت کے زیادہ مستحق ہونے کے دریافت پر فرمایا کہ تیری ماں اور چوتھی دفعہ فرمایا کہ تیرا باپ۔ ایک دفعہ آپؐ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ صحابہ کرام بھی موجود تھے آپؐ نے فرمایا وہ خوار ہو وہ خوار ہوا وہ خوار ہوا، صحابہ کرامؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ؟ ارشاد ہوا وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کر لی۔ (1)

مختصر یہ کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی فرمانبرداری فطری انسانی جذبہ اور صرف ایک دینی فریضہ ہی نہیں بلکہ ایک معاشرتی اور تمدنی ضرورت بھی ہے۔ جس کے ہونے یا نہ ہونے کے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سے حسن سلوک معاشرے کے دوسرے افراد کو ایثار، ہمدردی اور محبت کے جذبات کا سبق دیتا ہے۔ ان سے بدسلوکی یا ان کی حقوق سے غفلت کے نتیجے میں معاشرے میں نافرمانی کی فضا پیدا ہوتی ہے جس سے معاشرے میں ہم آہنگی اور یگانگت کی بجائے انتشار اور افتراق پیدا ہوتا ہے، معاشرتی اقدار کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ اور معاشرتی ربط اور استحکام مفقود ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشرے میں والدین کی عزت و شرافت اور ان کی اطاعت و خدمت کو معیار سمجھا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں والدین کے حقوق کے ساتھ ساتھ والد کے حقوق بھی مقرر ہیں اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے لیکن اولاد کے حقوق کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ نبی کریمؐ کی تعلیمات میں چھوٹے بڑے، والدین اور اولاد کے حقوق کی یکساں تاکید کی گئی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں والدین اور اولاد کے حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ اولاد پر والدین کی اطاعت اور ان کا احترام لازم کر دیا گیا ہے تو والدین کیلئے بھی اولاد کی تعلیم و تربیت، ان کے ساتھ محبت و شفقت کا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

''بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں''۔

یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس بنیادی اصول پر عمل پیرا ہو کر انسانی جماعت اور معاشرہ میں کسی قسم کی ناگواری اور رنجش وغیرہ کا نام و نشان نہیں رہ سکتا ہے۔

اولاد کا سب سے اولین حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ قصداً اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں، بلکہ اس کی تکمیل اور اس کی نشوونما کی ترقی کے وہ تمام ذرائع مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں یہی سبب ہے کہ اسلام نے اولاد کشی کے وہ تمام رسوم

---

(1) امام مسلم، صحیح مسلم، قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۷۵

ورواج اور ذرائع مسدود کر دیئے جو اسلام سے پہلے مختلف معاشروں میں رائج تھے۔ قدیم معاشروں میں مذہبی بنیادوں پر بھی اولاد کشی ہوتی تھی یعنی نذر مان کر بتوں یا دیوتاؤں پر اولاد کی قربانی دی جاتی تھی یا پھر اقتصادی اور معاشی خوف کی بناء پر اولاد کی قتل ہوتی تھی۔ بعض اوقات شرم ور عار سے بچنے کے لئے لڑکیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔(1)

عربوں کے علاوہ بھی بہت سے بت پرست معاشروں میں اولاد کشی کا رواج تھا۔ رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا اختیار باپ کو حاصل تھا اس قتل کی کوئی باز پرس نہیں تھی۔ اور کثرت سے اولاد کشی کا اعلانیہ رواج تھا۔ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ رسم لڑکیوں کی شادی کی شرم وعار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑکیوں کی جوا کی صورت میں رائج تھا، اور اولاد کشی کی سب سے عام صورت یہ تھی کہ بتوں دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لئے اولاد کی قربانی دی جاتی تھی۔ (2)

اسلام سے پہلے عربوں میں بالخصوص اور باقی تمام قوموں میں بالعموم یہ معاشرتی برائی تھی کہ لڑکی کی پیدائش کو باعث شرم سمجھا جاتا تھا اور اس پر دکھ ورنج کا اظہار کیا جاتا تھا۔ قرآن پاک نے اس معاشرتی برائی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ
يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ (3)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اسی کو مٹی میں چھپادے (یعنی دفن کر دے)

ایک ترقی یافتہ، پرامن اور پرسکون معاشرے کے قیام کیلئے اسلامی تعلیمات سے جہاں دوسرے معاشرتی برائیوں اور امتیازات کا خاتمہ ہوا۔ وہاں اولاد کشی اور دختر کشی کے رسوم بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ نبی کریمؐ نے پہلے اخلاقی تعلیم کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں یہ بات راسخ کی کہ لڑکیوں کا وجود باعث مصیبت اور شرم وعار نہیں بلکہ باعث رحمت اور نجات ہے آپ نے فرمایا کہ جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کو مصیبت میں مبتلا

---

(1) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۳۶، ۱۴۰۔ سورۂ اسراء کی آیت نمبر ۳۱، سورۂ نحل کی آیت نمبر ۵۹

(2) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا باب نمبر ۴ (3) القرآن، ۱۶:۵۹، ۶۰

دیکھ کر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی۔ وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی۔ (1) نیز فرمایا کہ جو دولڑکیوں کی بھی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا۔ (2)

اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اولاد کشی کی رسم کی انسداد کے لئے نبی کریمؐ عورتوں اور مردوں سے بیعت لیا کرتے تھے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے اس لئے جو عورتیں اسلام لاتیں ان سے توبہ کی جو بیعت لی جاتی تھی اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ فتح مکہ کے دن عورتیں اور مرد جوق درجوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے تو آپؐ نے عورتوں سے خاص طور پر اولاد کو نہ قتل کرنے کا عہد لیا۔ اس کے علاوہ دوسرے اجتماع عام کے موقع پر بھی جب نبی کریمؐ عورتوں کے مجمع میں تشریف لاتے تو دوسری باتوں کے علاوہ اولاد قتل نہ کرنے کا عہد لیتے تھے۔ (3)

قرآنی تعلیمات نے اولاد کشی کا انسداد کر کے اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ(4)

''اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمارے پرودگار ہماری اولاد اور ہماری بیویوں
سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اسلام کے معاشرتی تعلیمات کے مطابق اولاد کا دوسرا حق رضاعت اور حفاظت سے متعلق ہے۔ اسلام نے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد یہ فرض قرار دیا کہ اولاد کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو بھی تسلیم کیا جائے۔ جب تک بچہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اسکی خبر گیری کی جائے اور اسکے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اسکی نگرانی اور کفالت کی جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان دونوں امور سے متعلق ذمہ داری والدین پر ڈال دی ہے تاہم جہاں مصارف کا تعلق ہے تو اس کا بوجھ تنہا باپ پر رکھا ہے۔ اسلامی فقہ میں رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی کافی تشریح کی گئی ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق) وغیرہ کے سبب شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا انتظام کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے اور اس کی شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس ہی مقرر کی گئی ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ

---

(1) امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب الادب، ج۴، ص۱۴۳ (2) ایضاً

(3) امام، صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب تفسیر سورۂ ممتحنہ، ج۳، ص۵۹۳

(4) القرآن، ۲۵:۷۴

الرَّضَاعَةَ، وَعَلَى الْمَوْلُوْدِلَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ(1)

اور مائیں اپنے بچوں کو پوری دو برس دودھ پلائیں یہ مدت اس کے لئے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرلے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔''

شیر خوارگی کے زمانہ میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اسکی زندگی کو سہارا دے تو اسلام نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا ہے اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اسکی اولاد کو بھی بہن اور بھائی کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (2)

''اور تمھاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمھاری دودھ شریک بہنیں''۔

مختصر یہ کہ اسلام نے اخلاقاً اور قانوناً اولاد کی رضاعت اور نشونما و ترقی کے لئے والدین ذمہ دار ٹھرائے ہیں ساتھ ساتھ بچوں کی نشوونما اور خدمت کو اتنا تقدس دیا ہے کہ اسکی بدولت غیر اور اجنبی افراد بھی معاشرے میں نسبی رشتوں میں منسلک ہوجاتے ہیں

ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی اور روحانی تربیت کا درجہ ہے۔

قرآن مجید نے مختصر سی آیت میں اہل و عیال کی تربیت کو واضح کیا ہے ارشاد فرماتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (3)

اے ایمان والوں: تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا خاندان کے بڑوں کا فرض ہے۔ یہ آگ جہنم کی آگ ہے مگر اس سے مقصود ان تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے ان کی حفاظت اور نگہداشت ہے جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اسی طرح گھر کے سربراہ پر اولاد کا اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنے بیوی اور بچوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

---

(1) القرآن،۲:۲۳۳ (2) ایضاً،۴:۲۳ (1) ایضاً،۶۶:۶

اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی وسعادت مندی کی دعا مانگنے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔، جس طرح نیک بندے اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ(1)

'' اور(اے خدا وند) مرے لئے میر ے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا، اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے ہوں''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کا آمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

نبی کریمؐ نے مختلف موقعوں پر اپنے اقوال اور اعمال مبارکہ سے اوالاد کی تعلیم وتربیت، ان کے ساتھ محبت، الفت اور شفقت اور مساوات وبرابری کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ایک دفعہ ایک اعرابی اقرع بن حابس نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو دیکھا کہ آپؐ حضرت حسنؓ کو پیار کررہے ہیں۔ اعرابی کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی اور کہا کہ کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا۔ اس پر نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم اور شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں، مزید فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ (2)

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کرآئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں۔ اس وقت نبی کریمؐ کے گھر میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ نے وہی ایک کھجور سائل عورت کو دیدی۔ اس نے کھجور کے دوٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا۔ نبی کریمؐ کو حضرت عائشہؓ کی زبانی معلوم ہوا تو فرمایا کہ'' جب کسی کو لڑکیوں سے کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لئے آڑ بن جائیں گی۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ'' جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اس کو یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو

---

(1) القرآن،۴۶:۱۵

(1) امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الرحمۃ الولد، ص۲۵۵

جوڑکر) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے''۔ (1)

ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ'' باپ کا اپنے بچوں کو کوئی ادب سکھانا ایک صالح صدقہ سے بہتر ہے''

ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔ (2)

معاشرتی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کیلئے اسلام نے والدین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کی بناء پر ترجیح نہ دے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رکھے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اُسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (3) اسلامی معاشرہ میں لڑکوں کے درمیان بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز نہیں ہے۔ دنیا کی اکثر شریعتوں اور قوانین کے برعکس اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں اس لئے کہ ہر ایک کو ان میں سے باپ کے کیساتھ برابر کی نسبت ہے۔ یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ دیا جائے تو نبی کریمؐ نے اس کو ظلم سے تعبیر کیا ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا اور چاہا کہ نبی کریمؐ کی شہادت ہو، انھوں نے آپؐ کی خدمت میں آکر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام ہبہ کیا ہے۔ عرض کی نہیں، فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہیں بنوں گا۔ (4)

اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں اس قانون کی، جو اسرائیلیوں رومیوں، ہندوؤں اور پرنے معاشروں میں رائج تھا، اور اب بھی بعض قوموں میں موجود ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اس کو کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کر دی گئی۔ باپ کی نظر میں اس کے تمام بچوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر ظلم کا جو سلسلہ قانونی طور پر رائج تھا، کا خاتمہ ہوا۔

معاشرتی حقوق اور تعلقات میں والدین اور اولاد کے بعد قریب ترین اور تیسرا درجہ زن و شوہر کا ہے۔ جس طرح والدین کے حقوق کی پاسداری بوڑھوں کی روحانی اور جسمانی تسکین اور سہولت کا ذریعہ ہے، اور اولاد کے حقوق پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا دارومدار ہے اسی طرح حقوق زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

---

(1) امام مسلم، صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ، باب فضل الا حسان الی البنات، ص ۳۳۰

(2) امام ترمذی، کتاب البر واصلہ، باب ما جاء فی ادب الولد، ص، ۶۸۱

(3) امام ابو داؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فضل ما عال یتیماء، ص، ۷۰۵، ۷۰۶

(4) ایضاً، ج ۳، کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل، ص، ۷۵

حقوق زوجین کے سلسلے میں اسلام نے نوع بشر کے سوچ وفکر میں جو بنیادی تبدیلی پیدا کی وہ یہ کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو اخلاق وروح کی ترقی کی مدارج میں مانع تسلیم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں بدھ جین، ویدانت، جوگ اور سادھوں تمام اسی نظریے کے پابند تھے۔ عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے لاتعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا۔ اسلام نے اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق و روح کی تکمیل جس قدر تجرد کی زندگی میں ہوسکتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ اخلاقی تکمیل تعلق ازدواج میں ممکن ہے۔ اسلئے کہ اخلاق حسن سلوک اور حسن معاملہ کا نام ہے۔ جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہوسکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لئے اس کو کونسے فطری مواقع مل سکتے ہیں ؟ ایسا انسان کس طرح معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس کرسکتا ہے؟ پھر دنیا میں اس عفت وعصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے؟ مذہبی تجرد کی پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس دعوی کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے سب سے پہلے اجتماعی زندگی کے لیے نکاح کو بنیاد بنایا۔ اور ہر عمر کے مرد وعورت کے لیے خیر و برکت کا سبب قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَاۗءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ(1)

اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کردیا کرو اگر غریب ہونگے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے اسے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا علم والا ہے۔

قرآنی آیت کے مطابق ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے مذہبی حیثیت سے اس بناء پر کہ اگر ایک کے تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے میں فارغ البالی ہو تو ایک کے ذریعے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا۔ معاشی لحاظ سے یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے اور اولاد ذریعے مزید کام کرنے والے بھی پیدا ہوں گے۔ معاشرتی لحاظ سے بھی نکاح خیر و برکت کا ذریعہ ہے اس لیے کہ نکاح کے ذریعے دو افراد، دو خاندانوں اور دو قبیلوں کے درمیان قربت اور رشتہ داری پیدا ہوتی ہے۔ معاشرتی ربط اور تعلق میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ معاشرتی برائیوں اور ناہمواریوں میں کمی آجاتی ہے۔ زوجین اور اولاد کی محبت انسان کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کرتی ہے، اور انسان کو وہ قوت اور طاقت فراہم کرتی ہے جس کا ازواجی زندگی کے بغیر

---

(1) القرآن، ۲۴:۳۲

تصور نہیں کیا جاسکتا۔

نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو رفاقت کیلئے ایک ایسے ساتھی کی تلاش اور ضرورت ہوتی ہے کہ زندگی کے ہر موڑ، ہر سختی، مصیبت اور آسائش میں ساتھ نبھا سکے۔ اس فطری جذبے کی تکمیل نکاح اور ازدواجی زندگی سے ہوسکتی ہے۔ چنانچہ زن وشوہر کے باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَo
وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا
وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ (1)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمھاری جنس سے تمھاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور محبت پیدا کردیا۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں''

قرآن مجید نے لفظ سکون سے میاں و بیوی کی رفاقت اور معاشرتی وسماجی استقرار کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازداجی تعلق کے فلسفہ اور مکمل غرض و غایت پر محیط ہے۔ انسان کا گھر اور اس کی ازدواجی زندگی دنیا کے حوادث اور مشکلات، مصائب میں امن وسکون اور چین کا گوشہ ہوتا ہے۔ معاشی اور معاشرتی حالات کتنے ناموافق کیوں نہ ہو، میاں بیوی مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں، رنج والم اور مصیبت کے ہر گھڑی میں ایک دوسرے کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس لیے زن وشوہر کے خوشگوار تعلقات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آثار اور قدرت میں شمار کیا ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی بیان کی گئی ہے جو زن وشوہر کے باہمی میل اور مہر ومحبت میں فرق ڈالتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (2)

اور وہ ان سے سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

---

(1) القرآن، ۳۰:۲۰، ۲۱ (2) ایضاً، ۲:۱۰۲

مرد وعورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشرتی اور معاشی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں ایک دوسرے کی پردہ پوشی، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ قرآن مجید میں شوہر و زن کی پردہ پوشی اور معاشرتی حاجت کو ''لباس'' سے تشبیہ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ(1)

عورتیں تمھاری لباس ہیں اور تم ان کی لباس ہو۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوااللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (2)

اے لوگوں اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، اس خدا کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحمتوں کا لحاظ رکھو۔ اللہ تمھاری دیکھ بھال کررہا ہے۔

انسان نے جب سے مدنی زندگی کا آغاز کیا ہے اس وقت سے اس میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ اس کے عمل میں تحریک طبعی کی جگہ تحریک فکری نے لی ہے۔ اور اس کے اعمال میں اخلاقی رنگ پیدا ہوا ہے۔ جو مدنی زندگی سے پہلے نہیں تھا۔ مدنی زندگی میں انسان کو بہت ساری پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مگر انسان نے ان معاشرتی اور اجتماعی پابندیوں کے عوض بہت کچھ پایا بھی ہے۔ اس کی استعداد میں اتنا بڑا اضافہ ہوا ہے، اس کے تخیلات اس قدر وسیع، اس کے احساسات مین اتنی شرافت و پاکیزگی آئی ہے اور اس کی راحانیت اتنی بلندی پر پہنچ گئی ہے کہ مدنی زندگی کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ انسان کو مدنی زندگی میں وہ اخلاقی آزادی ملی ہے جس کے بغیر اسے اپنے آپ پر اختیار حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ محض خواہشات کا وجود اور اس

---

(1) القرآن، ۲:۱۸۷ (2) ایضاً، ۴:۱

کی پیروی غلامی کا نام ہے۔ اس کے برعکس مدنی زندگی میں اخلاقی، مذہبی اور سیاسی قوانین کے سامنے سرتسلیم خم کرنا عین آزادی ہے۔

انسان کو مدنی زندگی کے ثمرات اس باہمی عہد و پیمان اور معاہدوں کی تکمیل کی صورت میں ملتے ہیں۔ جو اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی بنیاد ہے۔ قرآنی آیات کی روشنی میں انسان کا پہلا عہد اور معاہدہ وہ ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اور اپنی عبودیت کا اقرار کرکے کیا ہے (1) اس طرح ایک انسان اس فطری معاہدے کی پاسداری کر کے دنیا و آخرت کے فوائد حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے بعد انسانوں کے درمیان معاہدات میں پہلا معاہدہ میاں بیوی کا ہے جو دونوں نکاح کی صورت میں کرتے ہیں۔ اس لیے نکاح ایک دینی فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بنیادی عمرانی معاہدہ بھی ہے جس پر خوشگوار اور مستحکم معاشرتی زندگی استوار ہوتی ہے۔

نکاح دو آزاد اور خود مختار افراد کے درمیان معاہدہ ہے۔ عورت اور مرد کی رضامندی نکاح میں بنیادی عنصر ہے جس کا اظہار نکاح کے وقت "ایجاب اور قبول" کی صورت کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے حقوق زوجین کے حدود کا تعین ہوتا ہے۔ جس کے مطابق خانگی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت ایک دوسرے کے تعاون، مولات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کی جاتی ہے۔ اس معاہدے کی رو سے روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہچانا مرد کا فرض قرار دیا ہے۔ مرد پر یہ واجب ہے کہ وہ عورت کی نان ونفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو۔ اگر مرد اس فرض کی آدائیگی میں کوتاہی کرے تو عورت قانونی طور پر یہ حق وصول کرسکتی ہے اور اگر اس طرح حق وصول کرنے میں مشکل ہو تو بیوی کو شوہر سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے۔ (2) جبکہ خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے۔ (3) اگر کوئی بخل کی وجہ سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لیا کرے۔ فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ وہ مجھے میری اور میرے بچے کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لو، فرمایا تم

---

(1) ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ جسمیں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا ہے۔

(2) فقہی اصطلاح میں اس اختیار کو ''خلع'' کا نام دیا جاتا جس کی تفصیل فقہ کی مختلف کتابوں میں ''کتاب النفقہ'' کے عنوان سے موجود ہے۔

(3) ملاحظہ ہو سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۲۳۳ ''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''

قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔ (1)

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے مرد عورت کے باہمی حقوق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے اس کی نسبت ہر ایک سے باز پرس ہوگی۔ مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے اور اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اس سے اس کی باز پرس ہوگی۔(2)

مختصر یہ کہ عورت اور اولاد کی کفالت مرد کی ذمہ داری ہے جبکہ شوہر کی اطاعت، بچوں کی پرورش اور نگہداشت، گھر بار، مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت بیوی کا فریضہ ہے۔ نکاح کی صورت میں اس معاہدے کی پاسداری سے مرد و زن کی انفرادی اور اجتماعی و معاشرتی زندگی خوشگوار اور پائیدار رہ سکتی ہے۔ دوسری طرف ان حقوق و فرائض سے غفلت اور لاپرواہی سے معاشرتی زندگی میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔ جس کا منفی اثر اولاد پر ہوتا ہے۔ یوں پورا معاشرہ مقصدیت سے دور اور باہمی اتحاد و اتفاق کی بجائے انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

والدین، اولاد اور زن و شوہر کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام صلہ رحم ہے۔ اسلام کے معاشرتی اور اخلاقی تعلیمات میں صلہ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب اور معاشروں سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن مجید میں کم از کم بارہ آیات میں اس کی صریح تاکید کی گئی ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ (3)

اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کرو۔

ایک اور جگہ یہ تصریح فرمائی ہے کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی کے لیے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت داروں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (4)

''اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے مال و دولت کو اس کی محبت پر قرابت
داروں کو دیا''

والدین کے بعد اہل قرابت ہی مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا

---

(1) امام بخاری، صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل، ص ۸۷۵، ۸۷۶

(2) ایضاً، باب ''قو انفسکم و اهلیکم ناراً'' ص ۷۷۴

(3) القرآن، ۲۶:۱۷ (4) ایضاً! ۲:۱۷۷

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَ قْرَبِيْنَ (1)

کہو کہ جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے۔

رشتہ داروں کیساتھ حسن سلوک اللہ تعالیٰ کے ان احکام میں سے ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّااللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِى الْقُرْبٰى (2)

اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا ہے کہ صرف اللہ کی عطاعت کرنا اور والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے اہل قرابت کی امداد کو عدل واحسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا ہے

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى (3)

بے شک اللہ تعالیٰ عدل واحسان اور قرابر دار کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

اگر کسی قرابت دار سے کوئی قصور ہو جائے تو مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ سزا کے طور پر اپنی امداد اس سے روک لیں۔ ارشاد ہے

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ (4)

اور جو لوگ تم میں بڑائی اور وسعت والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔

اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت وتوحید اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسری چیز اہل قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى (5)

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، اور والدین وادر قربت داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔

---

(1) القرآن، ۲:۲۱۵ (2) ایضاً، ۲:۸۳

(3) ایضاً، ۱۶:۹۰ (4) ایضاً، ۲۴:۲۲

(5) ایضاً، ۴:۳۶

معاشرتی حقوق میں قرابت داروں کے حقوق کی اہمیت کے پیش نظر نبی کریم ﷺ اپنی تمام محنت، رحمتوں اور تکالیف ومصائب کا جو تبلیغ اور دعوت حق میں ان کو پیش آئیں، اور اپنے اس احسان وکرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ تمام انسانوں پر فرمایا، بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب کرتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابر مندوں کا حق ادا کیا جائے اور ان سے لطف ومحبت سے پیش آئیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى (1)

کہہ اے نبی ! کہ تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ رشتوں میں محبت اور پیار کرو۔

عربی زبان میں قرابت داروں کا حق ادا کرنے کو "وصل رحم" کہتے ہیں اور اس کا متضاد لفظ "قطع رحم" ہے کہ رحم مادری ہی تعلقات قرابت کی جڑ ہے۔ کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہمسائگی، کہیں ہم وطنی اور کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک اور باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے کے لیے حقوق و فرائض کی نگہداشت اور ادائیگی ضروری ہے۔ معاشرے کے جو افراد ان حقوق وفرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں اور صلہ رحمی کی بجائے قطع رحمی کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں انھیں فاسق کہا گیا ہے اور بتایا ہے کہ معاشرہ میں فساد اور بگاڑ کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ o الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (2)

اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے، جو اللہ تعالیٰ کا عہد باندہ کر توڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں

نبی کریم ﷺ نے مختلف موقوں پر صلہ رحمی یعنی قرابت داروں کے حقوق کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ آپ ؐ نے " رحم" کو استعارے کے طور پر مجسم صورت میں پیش کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے اس لئے محبت والے رب نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا، اس کو میں

---

(1) القرآن، ۴۲:۲۳ (2) ایضاً، ۲:۲۶، ۲۷

نے ملایا جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا"(1) ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ "رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے۔ "جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے (2)۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن تھام لیا، خدا نے فرمایا۔ ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا، جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا۔ کیا تو اس پر خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں ملاؤں اور جو تجھ کو کاٹے اس میں اپنے سے کاٹوں(3) یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے درمیان میں حرفوں کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے۔ اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہل قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس اشتراک کی طرف خود قرآن مجید کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے سورۃ نساء میں ارشاد فرمایا ہے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ(4)

اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسے سے دوسرے سے درخواست کرتے ہو اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیت کریمہ کی تشریح اس حدیث مبارکہ سے ہوتی ہے کہ ایک صحابی رسولؐ نے نبی کریم ﷺ سے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا گیا کہ اللہ کی بندگی کرو، کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، نماز ادا کرو زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق (صلہ رحمی) ادا کرو۔ (5) جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا(6)

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں و سعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے (7) صلہ رحمی کی عام طور پر دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے یعنی مالی اور جسمانی تعاون اور مدد صلہ رحمی کی صورتیں ہیں۔ مالی مدد اور تعاون کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی جبکہ جسمانی اعانت کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں مال اور عمر میں برکت کی خوشخبری دی گئی ہے اس کی وضاحت معاشرتی اور

---

(1) امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب البر والصلہ، ص۲۴۳
(2) ایضاً، ص۲۵۱
(3) امام بخاری، صحیح البخاری کتاب البر والصلۃ والادب، ص۲۵۱
(4) القرآن، ۴:۱
(5) امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب لادب، فضل صلۃ والرحم، ص۲۴۹
(6) ایضاً، باب الم االقاطع، ص۲۵۰
(7) ایضاً کتاب الادب، ص۲۵۰

مادی نقطہ نظر سے یوں کی جاتی ہے کہ مال و دولت اور دنیا وی زندگی کی طلب اور خواہش ہر انسان اس لئے کرتا ہے کہ اس کو سکون، اطمینان اور مسرت حاصل ہو جائے۔ مال و دولت کی کثرت کے با و جود بھی اگر خانگی افکار اور معا شرتی، کشمکش کی وجہ سے اس سے لذت اور اطمینا ن حاصل نہ کیا جا سکے تو اس طرح کی مال اور و دولت کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس طرح اگر انسان کی صحت اچھی نہ ہو۔ بستر علالت پر طویل زندگی بھی راحت و اطمینان کی بجائے عذاب اور مصیبت بن جاتی ہے۔

حدیث مبارکہ میں صلہ رحمی کو وسعت رزق اور عمر میں برکت کا سبب اس لئے بتایا گیا ہے کہ عزیز و اقرباء اور رشتہ داروں سے حسن سلوک کی بدولت بہت ساری خانگی لڑائی اور جھگڑوں، جو کہ انسان کیلئے پریشانی کا سبب ہوتے ہیں، کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو لوگ قرابت داروں کے ساتھ نیکی کا برتا و کرتے ہیں، صلہ رحمی اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی زندگی میں خانگی مسرت اور طما نیت سے بھر پور ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت ہوتی ہے۔

احادیث مبا رکہ میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلہ رحمی کا کما ل یہ نہیں ہے کہ بدلہ کے طور پر صلہ رحمی کی جائے بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحمی کرتا ہے اس کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کیا جائے۔ (1)

مختصر یہ کہ اسلامی تعلیما ت میں قرابت دارروں کے حقوق کو بہت وسعت اور اہمیت دی گئی ہے اور ان کی حقوق سے غفلت اور لا پر واہی معا شرتی انتشا ر اور ''فسادفی الا رض'' کا سبب بتایا ہے۔

ہمسایہ اور پڑوسی دو افراد یا دو خاندان ہیں۔ جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔ بشریت اور اس کے تمدن کی بنیا د باہمی اشتراک عمل، تعاون اور حولات و معا ہدا ت پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کا محتاج ہے۔ اگر ایک بھو کا ہے تو دوسرے پر اس کا حق ہے کہ اپنے کھا نے میں اس کو بھی کھلائے۔ اگر ایک بیما رہے تو جو تندرست ہو اس کی تیما رداری کرے۔ اگر ایک پر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدر دبنے۔ یوں اس معا شرتی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی لڑی میں پیروی کی جاتی ہے۔ ہر انسان ایک طرف جسمانی اور مادی حیثیت سے بجائے خو دایک مستقل اکا ئی اور عنصر ہے تاہم دوسری طرف روحا نی، عقلی اور جذبا تی طور پر افراد ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں۔ کہ ایک کیمیائی مرکب کی مثال کرتے ہیں۔ اس لئے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آبادہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری ڈالی ہے کہ کیونکہ بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچے کا ندیشہ بھی زیا دہ ہوتا ہے جو اس کے ہو۔

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بلا مکافی، ص۲۵۲

اس لئے قریب رہنے والوں (پڑوسیوں) کے باہمی تعلقات کو خوشگوار اور ایک دوسرے سے قریب رکھنا، مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے تاکہ معاشرتی برائیوں کا سد باب کرتے ہوئے پڑوسی اور ہمسایہ معاشرتی زندگی کو بہشت کونمونہ بنا سکے۔ باہمی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام کے معاشرتی نظام میں انہی اصولوں کے سامنے رکھتے ہوئے ہمسایوں کے حقوق وفرایض مقرر کئے ہیں۔ یوں تو اسلام سے پہلے عرب معاشرہ میں بھی پڑوسی اور ہمسائیگی کے حقوق کی اہمیت تھی۔ اور ان حقوق کی ادائیگی کو عزت اور شرافت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے عربوں کے اس احساس کو چند ترامیم اور اصلاحات کے ساتھ اور زیادہ قوی کردیا۔ اور ہمسائیگی کا دائرہ پہلے سے بھی زیادہ وسیع کر دیا۔ جس میں سفر کے دوران رفیق، ایک مدرسے کے دو طالب علم اور ہر قسم کے شرکائے کار کو شامل کر دیا گیا۔ اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور محبت رکھا۔ تاہم قرآن نے ہمسائیگی کے ان اقسام کے حقوق درجہ بدرجہ مقرر کئے ہیں اور تقدم اس کو حاصل ہے جس کے ساتھ ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا کوئی دوسرا تعلق بھی قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَالْجَارِذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (1)

اور (خدائے نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)۔

نبی کریم ﷺ نے اس حکم الٰہی کی تفسیر مختلف طریقوں سے فرمائی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ بتایا۔ ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ ﷺ تشریف فرماتھے تو آپؐ نے ایک خاص دل نشین انداز میں فرمایا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ صحابہ کرام نے پوچھا کون یارسول اللہ فرمایا وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں۔ (2) ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا جو شخص اللہ اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔ (3)

ایک اور موقع پر نبی کریم ﷺ نے اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا۔ ارشاد فرمایا۔ اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھیوں میں بہتر ہے۔ اور پڑوسیوں میں بہتر ہو ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہے۔(4)

---

(1) القرآن، سورۂ نساء،۴:۳۶

(2) امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب الادب، اثم من لا یامن جارہ، ،ص۲۶۲

(3) ایضاً، باب من کان یئومن باللہ والیوم الآخر فلاینو ذجارۂ،ص۲۶۲

(4) جامع ترمذی، باب البروالصلہ و باب ما جاء فی حق الجار،ص۲۷۸

حضرت عائشہ کی تعلیم کی غرض سے آپؐ نے ان سے فرمایا کہ جبرائیل نے مجھے پڑوسیوں کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ مجھے خیال ہوا کہ کہیں ان کو وارثت کا حق نہ دلا دیں۔ (1) اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمسایوں کے حقوق اور رشتہ داروں کے حقوق کا درجہ قریب ہیں۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی، اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم تحفے اور تحائف کا تبادلہ ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اسی بنا پر ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے پوچھا یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں۔ فرمایا جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو (2)، آپؐ نے ابو ذرؓ کو نصیحت کی کہ اے بو ذر جب شوربہ پکاؤ تو پانی بڑھادو۔ اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو (3) عورتوں کو خصوصیت کیساتھ مخاطب کر کے آپؐ نے فرمایا کہ اے مسلمانوں کی عورتوں !تم میں سے کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی کو حقیر نہ جانے، اگر چہ وہ ایک کھر اس کو ہدیہ میں بھیجے۔

ایک مسلمان معاشرے کا فرد خود آرام و آسائش میں رہ کر اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف سے بے پروا نہیں ہوسکتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، وہ مومن نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔(4)

معاشرتی بُرائیوں، چوری اور بدکاری وغیرہ کو ہر مذہب اور معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ہر جگہ ان برائیوں کا احتمال رہتا ہے۔ تاہم یہی بُرائیاں اگر پڑوسیوں میں ہوں تو اُخروی اوراخلاقی لحاظ ان کی سزا دوہری ہو جاتی ہے پھر یہ معاشرتی برئیوں کے ساتھ خیانت اور بد دیانتی بھی شمار ہوتے ہیں اس لئے دوسرے مذاہب میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کو دس گناہ زیادہ بُرا کر کے دکھایا۔ ایک سوال کے جواب میں آپؐ نے فرمایا۔

زنا حرام ہے خدا اور رسول نے ان کو حرام کہا ہے۔ لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے، خدا اور رسول نے اس کو حرام کہا ہے۔ لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے، (5)

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نماز پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں صدقہ خیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں۔ لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا، تو

---

(1) صحیح بخاری، کتاب الاداب، باب الوصاء بالجار، ص۲۶۱

(2) ایضاً، کتاب الاداب، باب حق الجوار فی قرب الابواب، ص۲۶۳

(3) صحیح مسلم کتاب البر واصلہ ما جاء فی حق الجور، ص۳۲۹

(4) صحیح کتاب الادب، باب لاتحقرن جارۃ لجارتہا، ص۲۶۲

(5) امام بخاری، ادب المفرد، باب حق الجار، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۱۹۹۷ء، ص۱۳۲

فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں، ان کو دوزخ کی سزا ملی گی۔ پھر صحابہ نے دوسری عورت کا حال سنا یا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں۔ اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں فرمایا یہ عورت جنتی ہو گی (1)۔

نبی کریم ﷺ نے ہمسایوں کے حقوق کی ادائیگی کو آخرت پر ایمان کی نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے جس شخص کا اللہ اور روز آخرت پر ایمان ہو وہ اپنے ہمسایہ کی خاطر کرے اور جو شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کی پرتکلف خاطرداری کرے۔ صحابہ کرام کی عرض کرنے پر فرمایا کہ تین تک ضیافت ہے اس کے بعد خیرات ہے ۔ (2)

نبی کریم ﷺ کے انہی تعلیمات کی رشنی میں جو اسلامی معاشرہ قائم ہوا تھا اس میں ہمسایوں میں دوست و دشمن، مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اُٹھ گئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی۔ ان کے پڑوسی میں ایک یہودی بھی رہتا تھا۔ انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا ہے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبرائیل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار نہ دیں۔ (3) اسلامی معاشرہ میں دوسرے معاشرتی حقوق کے ساتھ ساتھ عام حاجتمند اور ضرورت مند افراد کی خیرخواہی اور بھلائی کی تاکید کی گئی ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان خواہ وہ کس قدر حاحب دولت اور بے نیاز کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔ اور اس کو دوسروں کی مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس لئے جمیعت بشری کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے۔ اور معاشرے کا فرد بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجتمند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے۔ اور یہ نہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قران مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد تے ہیں۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (4)

(اور ان کے مال سائل اور محرام کا حق ہے)

(اور ان کے مال سائل اور محروم کیلئے مقررہ حق ہے)

سائل ہر ضرورت مند اور محروم سے مراد وہ مصیبت زدہ انسان ہے جو قدرتی آفات کے نتیجے میں کمائی سے قاصر ہو۔ یعنی کسی معذوری یا مال و دولت کی ہلاکت کی بناء پر معاشی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اسلامی

---

(1) امام بخاری، ادب المفرد، باب لا یؤذی جارہ، ص ۱۲۳

(2) صحیح البخاری، کتاب الاداب، باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہٗ، ص ۲۶۳

(3) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب حق الجوار، ص ۷۰۷ (4) القرآن ۵۱:۱۹، ۷۰:۲۴، ۲۵

معاشرہ میں ایسے افراد کی حاجت روائی اور معاشی لحاظ سے معاشرہ کے سرگرم رکن بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ اور ایسے افراد کو معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے معاشرہ کے فعال رکن بنایا جاتا ہے۔ اس کے لئے زکواۃ اور صدقات کا ایک مربوط اور جامع نظام وضع کیا گیا ہے جس پر عمل درآمد کر کے معاشرے کا کوئی فرد ہمیشہ کے لئے محروم اور لاچار نہیں رہ سکتا۔

اگر کوئی شخص سائل کی حاجت روائی نہیں کر سکتا ہے تو اس کے ساتھ نرمی اور اچھے برتاؤ کی تاکید کی گئی ہے اور سختی سے جھڑکنے سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد تے ہیں۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ(1)

اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر

نبی کریم ﷺ کی عادت کی تھی کہ آپؐ سے سائل کبھی بھی خالی ہاتھ واپس نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی نبی کریم ﷺ سے درشت روئی سے پیش آتا تو بھی آپؐ نرمی کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک بار رسول اللہ ﷺ کیساتھ پیدل چل رہا تھا اس وقت نبی کرم ﷺ ایک نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک اعرابی آپہنچا اور چادر پکڑ کر زور کھینچی کہ گردن مبارک کے ایک جانب چادر کی کنارے سے نشان پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا محمد خدا کا مال جو تمہارے پاس ہے اس میں کچھ مجھے دینے کا حکم دو۔ رسول اللہ ﷺ سے اس کی طرف منہ پھیر کر دیکھا اور ہنس کر اس کو کچھ بخش دینے کا حکم دیا۔ (2) یہی تعلیمات صحابہ کرام کو بھی دی گئی تھیں۔ بتایا گیا تھا کہ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا۔ اور جو مسلمان کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کرے گا۔ تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔ (3)

صحیح بخاری میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو آپؐ صحابہ کرام سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمھیں بھی ثواب ملے گا (4) ایک دفعہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کر اگر کچھ نہ ہو سکے تو بے کس حاجتمند کی مدد کیا کرو۔ (5) کسی کی حاجت روائی صرف مالی اعانت تک محدود نہیں بلکہ ایک انسان کو کسی بھی

---

(1) القرآن، ۹۳:۱۰

(2) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب التبسم والضحک، ص۲۹۴

(3) جامع ترمذی، ج ا، باب ما جاء فی الستر علی المسلمین، ص۶۷۲

(4) صحیح بخاری کتاب الادب، باب تعاون المومنین، ص۲۶۶

(5) جامع ترمذی ج ا، کتاب البر والصلہ، ص۶۸۲

ممکنہ تکلیف سے بچانے پر اللہ تعالیٰ راضی ہوکر انسانی گناہوں کو معاف فرماتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جوشخص راستہ چلنے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خدا وند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔ (1)

مختصر یہ کہ قرآنی آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ کی رو سے اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کیلئے یہ لازم قرار پایا ہے کہ ضرورت مند اور حاجتمند کی مدد اور حاجت روائی کر کے معاشرتی دھارے میں شامل کیا جائے تاکہ معاشرے پر بوجھ کی بجائے وہ معاشرے ایک فعال اور سرگرام رکن بن سکے۔ اسلامی معاشرہ میں دوسرے حقوق و فرائض کے علاوہ مہمان اور میزبان کے حقوق و فرائض اور باہمی تعلق کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان حقوق و فرائض اس کی بنیاد اس عقیدہ اور تصور کائنات پر ہے کہ کائینات اور تماوسائل کا حقیقی خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کو جہاں اشراف المخلوقات اور خلیفہ اللہ فی الارض بنا کر بھیجا ہے، ہاں انسانوں میں صلاحیتوں اور معاشی لحاظ سے تفاوت ضرور ہے، بعض کو بعض پر درجات حاصل ہے جس کے نتیجے میں کائنات انسان کے لئے مسخر ہے۔ اس کے علاوہ انسان معاشی وسائل پر جو دسترس رکھتا ہے یہ آزمائش کے طور پر ہے۔ انسان کو خود مختار ملکیت نہیں دی گئی ہے کہ وہ جس طرح چاہے خرچ کرے، بلکہ مقررہ قواعد اور قوانین کے مطابق کمانے اور خرچ کرنے کا پابند ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ تمام انسان اعیال اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی کنبہ کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ایک انسان کے دوسرے انسان کے وسائل اور صلاحیتوں میں حق ہے۔ لہٰذا جب ایک اجنبی دوسرے علاقے میں جاتا ہے تو وہاں کے باشندوں کے معاشی وسائل اور دوسرے سہولیات میں بحیثیت مہمان اس کا حق ہوتا ہے۔

عمرانیاتی نقطہ نظر سے مہمان کے حقوق کی تشریح یوں کی جاتی ہے کہ چونکہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں۔ ابتدا میں جب بشری آبادی محدود تھی تو تمام انسان ایک دوسرے قریبی رشتہ دار تھے۔ رفتہ فتہ آبادی کی کثرت اور معاشی دسائل کی قلت کی بنا پر جمعیت بشری مختلف خطوں میں آباد ہوئے تو ان کے درمیان زبان اور رنگ کے اختلافات رونما ہوئے، تاہم جب ایک شخص دوردراز علاقے کو جاتا تو جمعیت بشری کا ایک فرد اور قرابت دار سمجھ کو اس کی خاطر و مدارت کی جاتی تھی مہمان نوازی کی یہ خصلت ہر انسانی معاشرہ میں نمایاں رہاہے۔

جدید نظام تمدن میں گوکہ مہمان نوازی کی قدیم رسم کی جگہ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں نے لی ہے جوکہ خالص معاشی اہمیت کی حامل ہے۔ مگر گزشتہ نظام تمدن میں مہمان نوازی کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور اب بھی یہ مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے۔ گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان توازی کی تعلیم کاذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں۔ لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض

---

(1) جامع ترمذی ج ۱، کتاب البر والصلہ، ص۲۸۲

سمجھا تا تھا۔ اسلام نے اس فرض کی اہمیت کواور بھی بڑھا دیا۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے مہمانو ں کا ذکر ان آیات میں آیا ہے۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَo اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَo فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍo فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَo فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (1)

(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے کہ جب یہ لوگ ان کے پاس آئے تو بولے سلام، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ کچھ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر جلدی سے گھر جا کر ایک موٹا تا زہ بچھڑا ان کے سامنے رکھا یا تو انھوں نے تامل کیا، پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں پھر جی میں گھبرائے ان سے، بولے تو مت ڈرا اور اس کو ایک ہوشیار فرزند کی، خوشخبری دی۔

آیات کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مہمان اور میزبان سلام اور دعائیہ کلمات سے ملاقات کا آغاز کرے۔ میزبان مہمان کے کھانے پینے آرام و آسائش کا فوراً انتظام کرلے۔ استطاعت کے مطابق مہمانوں کے لئے عمدہ کھانا اور دوسر آرام و آسائش کی سعی کرے۔ ساتھ ساتھ مہمانوں کو بھی عمدہ طریقے سے عذر کرنا چاہیے اس لئے کہ فرشتوں نے ابراہیم سے یہی کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو اپ کو خوف زدہ نہیں ہوتا چاہیے اور ابراہیم کو ہوشیار فرزند کی خوشخبری دی۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مہمان بھی میزبان کی دلجوئی کرے اور خوش کن تاثرات اور اچھی خبر کی بشارت دینے کی کوشش کرے۔

آرام دا آسائش کے ساتھ میزبان مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ آہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے۔ اس لئے جب قوم لوط نے مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین امیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں۔ سو مجھ کو رسوا مت کرو اور اللہ سے ڈرو اور میری آبرو مت کھوؤ۔ (2)

قرانی آیات کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو اس قدر اہمیت دی ہے

---

(1) القرآن، ۵۱:۲۴ تا ۲۸ (2) ایضاً، ۱۵:۵۸ تا ۷۶

کہ اس کو ایمان کا ایک جز و قرار دیا، کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لا یا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لا یا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کو جائز عزت دے، پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ اس کا جائز کیا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔ (1) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایک رات کی مہمانی تو واجب ہے پھر اگر مہمان کسی کے ہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض چاہے وہ لے لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔ (2)

چونکہ مہمان ہونا میزبان کے لئے باعث تکلیف بھی ہے اور کسی کے ہاں بلا وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف بھی ہے۔ اس لئے جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کو بتایا گیا ہے کہ دوسرے خوان کرم سے ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کہ ہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھرنا چاہئے، کیونکہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہو گی اور اس پر بار پڑے گا (3) اس کے بعد وہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی جس کو جوئی بھی غیور اور خود دار مہمان پسند نہیں کرے گا۔

اسلامی معاشرہ میں رشتہ داروں، والدین، اولاد اور ہمسایوں کے علاوہ مسلمانوں کے باہمی حقوق، آپس میں الفت و محبت اور اور اتفاق واتحاد پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ درحقیقت اسلامی معاشرہ نظریاتی، فکری اور دینی بنیاد پر قائم معاشرہ ہے، جس کے افراد دینی اخوت اور بھائی چارے میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔ قران مجید میں مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ ان کی اجتماعی وحدت دین اسلام کے ساتھ وابستگی اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے سے مشروط ہے، اور دینی اخوت اور محبت و الفت کو اپنی نعمت اور احسان قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (4)

---

(1) صحیح بخاری کتاب الادب، باب حق الضیف، ص۳۱۲

(2) امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ کتاب الادب، باب حق الضیف، اردو ترجمہ علامہ وحیدالزمان، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۲۶۰

(3) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف وخدمتہ، ص۳۱۳

(4) القرآن، ۳:۱۰۲تا۱۰۳

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور
تم نہ مرو لیکن مسلمان اور خدا کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے
رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور تم اللہ کے اس نعمت کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے، تو
اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کے درمیان یہ میلاپ اور محبت محض اللہ تعالیٰ کی فضل کرم کا نتیجہ ہے ورنہ روئے زمین کا سارا خزانہ لٹا کر اس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد تے ہیں۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ(1)

اور اللہ نے ان کے دل ملا دئے، اگر تو زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خرچ
کر دیتا، تب بھی تو ان کے دلوں کو نہ ملا سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ملا دیا،
بیشک وہ غالب آنے والا قادر مصلحت جاننے والا ہے۔

مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دین کی رسی کو، جو وحدت، یگانگی اور اخوت کا اصلی رشتہ ہے، مضبوطی سے پکڑیں۔ بصورت دیگر تفرقہ بازی اور آپس میں لڑائی جھگڑوں سے اسلامی معاشرہ مستحکم نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد تے ہیں۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ(2)

یہی باہمی اتفاق واتحاد ملت اسلامیہ کی عمارت کا ستون اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ ہے۔ جس کا نتیجہ مسلمانوں کے درمیان باہمی محبت والفت کی صورت میں نکلتا ہے۔ تاہم اگر مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیش آجائے تو اللہ اور رسول کی حکم کی طرف رجوع کی تاکید کی گئی ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (3)

پس اگر تم میں کسی بات پر جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اختلاف اگر شدت اختیار کرے اور لڑائی و جھگڑے کی صورت پیدا ہو جائے تو مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری بنتی ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور دونوں کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرادیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

---

(2) القرآن، ۸:۶۳ (3) ایضاً، ۸:۴۶ (1) ایضاً، ۴:۵۹

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (1)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرلے، تو اگر رجوع کرلے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو، اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں پس اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرادو۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح و تاکید نبی کریم ﷺ نے یوں فرمائی ہے کہ، مسلمان کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ (2) صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی ﷺ فرمایا، سارے مسلمان ملکر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضاء ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ ہوتا ہے تو سارے اعضاء اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی حال اسلامی معاشرہ کا ہے کہ معاشرے کے ایک فرد کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے معاشرے کو اس کا احساس ہوتا ہے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے۔ (3) بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپؐ نے ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط

---

(1) القرآن، ۴۹:۹ تا ۱۰

(2) صحیح بخاری، کتاب الادب، ص و صحیح مسلم کتاب البر والصلہ والاداب، ص، ۲۶۰

(3) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، ص ۳۲۱

ہوتا ہے۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے نہ اس کو بے مدد چھوڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے۔۔۔ انسان کے لئے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے مسلمان کا ہر حصہ مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا مال اس کا خون اور اس کی آبرو۔ (1) مزید فرمایا کر مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ تو وہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری کرے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردار رکھے گا۔ (2)

ابی داؤد میں یہ بھی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو کسی مسلمان کی دنیا وی تکالیف میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دان اس کی تکالیف میں سے کمی تکلیف کو دور کرے گا اور جو کسی تنگدست پر آسانی کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی کرے گا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ (3)

صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ ایک اور موقع پر جب صحابہ کرام نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے اچھا مسلمان کونسا ہے فرمایا، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان بچے رہیں۔ (4) صحابی رسول جریر بن عبداللہ بجلی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم کرنا، زکواۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا ۔ (5)

کئی موقعوں پر آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسق) ہے اور اس سے لڑنا قتال خدا کا انکار کفر ہے۔ (6) یہ اس لئے کہ مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا گیا ہے۔ جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ خدا کا انکار ہی ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں مسلمان کے ناحق اور

---

(1) صحیح البخاری، کتاب الادب، ۲۷۲، ۲۷۳

(2) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب المحو اخاۃ، ص ۶۱۱

(3) صحیح بخاری، باب المعونۃ للمسلم، ص ۶۳۰

(4) صحیح بخاری، کتاب الایمان، ج ۱، ص ۱۰۳

(5) صحیح بخاری، کتاب الایمان، ج ۱، ص ۱۰۳

(6) ایضاً، کتاب الادب، باب ما ینھی من السباب واللعن، ص ۲۷۳

قصداً قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کیلئے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد تے ہیں۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّلَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (1)

اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے گا۔ تو اس کا بدلہ دوزخ ہے وہ اس میں پڑا رہے گا اور اللہ کی اس پر غضب ہوا اور لعنت کی اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع آپؐ نے فرمایا دیکھو میرے بعد کا فر نہ ہو جا نا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ (2) یہ بھی فرمایا کہ جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں (3) ہر مسلمان پر لا زم ہے کہ دوسرے مسلمان کی نہ صرف جان بلکہ عزت و آبرو کی بھی حفاظت کرے۔ ارشاد نبوی ہے کہ جو کوئی کسی مسلمان کو ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے گا جسمیں اس کی عزت و آبرو پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو۔ تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا۔ تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔ (4)

اگر دو مسلمانوں کے درمیان کسی ناراضگی کے سبب معا شرتی تعلق منقطع ہو جائے تو نبی کریم ﷺ نے تین روز سے زیا دہ ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لئے جا ئز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ اُدھر منہ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کی ابتدا کرے (5) ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا آپس میں کینہ نہ رکھو۔ حسد نہ رکھو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہو، اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جا ؤ اور کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیا دہ بولنا چھوڑ دے ۔ (6)

ایک دفعہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ مومن پر لعنت کر نا یا س پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے۔ (7)

---

(1) القرآن، سورۂ نساء، ۴:۹۳

(2) صحیح بخاری، ج ۴، کتاب الدیات، باب ومن احیاھا، ص ۶۵۶

(3) ایضاً، کتاب الدیات، باب ومن احیاھا، ص ۶۵۹

(4) سنن ابی داؤد، کتاب الاداب، باب فی المعونۃ المسلم، ص ۶۳۰

(5) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الھجر ۃ، ص ۲۸۸ (6) ایضاً،

(7) ایضاً، باب من اکفر اخاہ بغیر تاویل فھو کما قال، ص ۲۹۹

یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کو کافر کہے۔ تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا۔ (1) چونکہ اسلامی معاشرے کی بنیاد اخوت اور بھائی چارے پر استوار ہوتا ہے اس لئے نبی کریم ﷺ نے ایک مومن کے دوسرے مومن پر حقوق مقرر کئے ہیں، اور بتایا ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے میں اس کی حفاظت کرتا ہے۔ (2) یعنی یہ کم سے کم اور ضروری حقوق ہیں جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ تمام حقوق اس برادرانہ اُلفت و محبت کے فروغ کیلئے ہیں جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہ ہوگا۔ جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔ (3)

مختصر یہ کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد دوسرے کے ساتھ ایسی محبت اور سلوک کرے جیسا وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان سمجھے اس طرز سلوک سے اسلامی معاشرہ مستحکم بنیادوں پر قائم رہ سکتی ہے۔

اسلام کے معاشرتی نظام میں حقوق انسان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ دور حاضر میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ انسان کے بنیادی حقوق کا تصور انگلینڈ کے میگنا کارٹا (Magna Carta) ٹام پین (Tom Paine) کے پمفلٹ ''حقوق انسانی'' انقلاب فرانس کی، منشور حقوق انسانی، اور اقوام متحدہ کے چند قراردادوں کی پیداوار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغربی دنیا میں انسانی حقوق کے تصور کی تاریخ دو تین صدیوں سے زیادہ پرانی نہیں۔ اور حقوق انسانی کا یہ تصور قوت نافذہ کے بغیر ایک خوشنما تصور سے زیادہ نہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے چودہ سال قبل ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے جو حقوق و فرائض مقرر کئے ہیں ان کو نہ صرف قوت نافذہ بلکہ وہ تقدس حاصل ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کے آدائیگی میں کوتاہی نہیں جا سکتی۔

اسلام نے ایک پر جو انسانی حقوق مقرار کئے ہیں ان میں چند ایک درج ذیل ہیں۔

(ا) سب سے پہلے اسلام میں ہر انسان کو جینے کا حق حاصل ہے۔ قرآن نے انسانی جان کی حرمت کا حکم دیا ہے۔ اور ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد تے ہیں۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ

---

(1) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب من اکفر اخاہ بغیر تاویل فھو کما قال، ص ۳۰۰

(2) سنن ابی داؤد، کتاب الاداب، باب فی النصحیۃ، ص ۶۲۰

(3) صحیح بخاری، کتاب الایمان، ج ا، ص ۶

النَّاسَ جَمِيْعًا(1)

جس نے کسی متنفس کو بغیر اس کے کہ اس نے قتل نفس کا ارتکاب کیا ہو، یا زمین پر فساد برپا کررہا ہو، قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اُسے زندہ رکھا گویا اس نے تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔

(۲) معذوروں اور کمزوروں کو تحفظ کا حق دیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث سے واضح ہے کہ عورت بچے، بوڑھے، زخمی اور بیمار کے اوپر جنگ اور امن کسی حال میں بھی ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔ خواہ اپنی قوم سے رکھتے ہوں یا دشمن قوم سے۔ نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین دشمنوں سے مقابلہ کے لئے فوجیں روانہ کرتے وقت صاف ہدایات دیتے کہ حملہ کی صورت میں کسی عورت، بچے، بوڑھے، زخمی اور بیمار پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔

(۳) حرمت جان کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و آبرو بھی ایک دوسرے پر حرام ہے۔ اور تمام انسانی برادری کو معاشی اور معاشرتی تحفظ دی گئی ہے۔

(۴) قرآن کریم ﷺ کا یہ اصول ہے کہ ہر انسان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى(2)

کسی قوم کی دشمنی تمھیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

اس آیت میں اسلام نے یہ اصول متعین کر دیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک کرنا اسلامی معاشرے کے افرد کی ذمہ داری ہے۔ اور اس میں دوست و دشمن یا اپنے بیگانے کو کوئی تصور نہیں۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ(3)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو گناہ اور سرکشی کے کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔

(۶) اسلامی معاشرہ میں تمام انسان یکساں اور مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ان میں رنگ، نسل، زبان یا نسب کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں، اگر کسی کو فصیلت اور برتری ہے تو وہ اخلاق اور تقویٰ کے اعتبار سے ہے۔

---

(1) القرآن، ۵:۳۲ (2) ایضاً، ۵:۸ (3) ایضاً، ۵:۲

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (1)

اے لوگو، ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک زن سے پیدا کیا اور تمھیں گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے تمام انسانوں کو ''نفس واحدہ'' سے پیدا کر کے اس میں جوڑے پیدا کئے۔ (2) جس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے اسلام میں نوع بشر کی برابری کی تعلیم دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ معصیت سے اجتناب اور ظالم کی اطاعت سے انکار وغیرہ کے معاشرتی حقوق ہر انسان کو حاصل ہیں۔ ہر انسان کے ساتھ خیر خواہی اور ہر دوسرے کے ساتھ رحم سے پیش آنے کی تاکید کی گئی ہے۔ حسد، بغض اور دوسرے معاشرتی برائیوں سے ہر انسان کو بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا کہ جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے۔ اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ۔ (3)

اسلامی معاشرہ میں حقوق کا دائرہ حیوانات اور نباتات تک وسیع ہے۔ اسلام سے قبل معاشرے حیوانات اور بناتات سے متعلق آفراط وتفریط کے شکار تھے۔ ایک طرف کچھ جانوروں اور درختوں کو مقدس مان کر ان کی پرستش کرتے تھے جبکہ دوسری طرف بعض رسوم کے ذریعے حیوانات تختہ مشق بنائے جاتے تھے۔ ہندی، مصری اور بعض دوسرے قدیم معاشروں میں گائے، بیل اور ریچھ وغیرہ کی پرستش کی جاتی تھی۔ عرب معاشرہ میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھ دیا جاتا تھا۔ اس کو خوارک اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دُنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے۔ کبھی جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے۔

اسلامی تعلیمات کے ذریعے انسانی سوچ وفکر اور طرز عمل اس افراط وتفریط سے پاک کر دی گئی۔ انسان کو بتایا گیا کہ دوسرے مخلوقات کی طرح حیوانات اور بناتات بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اور یہ انسان کے فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر کے اس کیلئے مسخر کی ہیں۔ لہٰذا وہ تمام رسومات اور عقائد وافکار ممنوع قرار

---

(1) القرآن، ۱۳:۴۹ (2) ایضاً، ۱:۴

(3) جامع ترمذی، باب ماجاء فی معاشرۃ الناس، ص ۲۹۰

دے گئے جن میں حیوانات اور نباتات کی پرستش کی جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ انسان پر ان تمام حیوانات اور نباتات کا حق ہے کہ بلا وجہ یا کسی فائدے کے بغیر ان کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ ان کی زندگی کی حفاظت کی جائے اور ان کے آرام و آسائش اور خوارک وغیرہ کا خیال رکھا جائے۔ نبی کریم ﷺ نے بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کو بہت بڑا گنا قرار دیا ہے۔

غیر مضر یا مفید جانوروں کا مارنا بھی جائز نہیں چنانچہ آپؐ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ جو جانور ضرورتاً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں ان کے بارے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ اس لئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تم میں سے ہر شخص اپنی چھری تیز کرلے اور اپنے ذبیحے کو آرام پہنچائے۔ (1)

نبی کریم ﷺ نے بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے۔ اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔ نبی کریم ﷺ سے کا ارشاد ہے کہ ایک عورت صرف بلی کی وجہ سے دوزخ میں داخل کی گئی۔ بلی کو اس نے باندھ کر رکھا تھا نہ خود اس کو خود کھانے دیتی تھی نہ چھوڑ دیتی تھی کہ وہ کچھ کیڑے مکوڑے کھا سکے۔ (2)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی۔ اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اُتر کر پانی پی لیا۔ کنوئیں سے نکل کر دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا تھا اور کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کرتے ہوئے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اُتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا۔ صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ اچھا سلوک کرنا مؤجب ثواب ہے صرف حیوانات ہی نہیں بلکہ نباتات کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا مؤجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے۔ یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا، انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ ہے۔ انہی تعلیمات کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے بھی اصول بتائے۔

(ا) جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے وہی کام لینا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کیلئے پیدا نہیں کیا گیا ہوں۔ صرف کھیتی باڑی

---

(1) صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح، ص۱۵۲

(2) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب خمس من الدواب فواسق، یقتلن فی الحرم، ص۶۰۰

کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ۔ اللہ نے ان کو تمہارے لئے فرمانبردار صرف اس لئے بنایا ہے کہ تم وہ ایسے مقامات تک پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے تمہارے لئے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے۔ اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو۔ (1)

(۲) جانوروں کے ارام وا سائش کا خیال رکھنا چاہئے چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ۔ (2) ایک بار آپؐ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ ان پر سواری کرو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو جاؤ اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔ (3)

(۳) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔(4)

(۴) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا کہ اس سے وہ بے فائدہ زخمی ہوکر ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔(5)

---

(1) صحیح بخاری، ج ۲، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب استعمال البقرۃ للحراثۃ، ص ٦٧

(2) صحیح مسلم، ج ۲، کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنھی عن التعریس فی الطریق

(3) سنن ابی داؤد، ج ۲، کتاب الجہاد، ص ۳۲۰

(4) ایضاً، ص ۳٦۲

(5) ایضاً

فصل سوم

اسلام میں عورت کا مقام:

کائنات کی تخلیق اور کائنات کے تمام انواع کی دو اصناف میں تقسیم خالق کائنات کا سربستہ اور ناقابل پیمائش راز ہے۔ کائنات کے چھوٹے ذرے ایٹم کا وجود تب برقرار رہ سکتا ہے، جب اس کے مرکز اور مدار میں موجود منفی اور مثبت ذرات کے درمیان توازن ہو، ستاروں اور سیاروں کی گردش دو قوتوں یعنی مرکز گریز اور کشش ثقل کی بدولت ہے، جمادات، نباتات اور حیوانات کی دو اصناف میں تقسیم، مرئی اور غیر مرئی اشیاء مثلاً دِن رات، سورج چاند، دُکھ سکھ وغیرہ تمام نر مادہ میں منقسم ثنویتی وجود رکھتے ہیں جس کے ساتھ تمام کائنات اور انسان کی حیاتیاتی ضروریات وابستہ ہیں. یہ ثنویتی وجود یا ''زواج'' اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ(1)

اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں تا کہ تم دھیان کرو۔

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ (2)

ان دونوں میں پھل ہوں جوڑے جوڑے۔

وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (3)

اور جس نے بنائے سب چیز کے جوڑے اور تمھارے لئے کشتیوں اور چوپایوں کو بنا دیا جس پر تم سوار ہوتے ہو۔

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى(4)

اور اسمان سے پانی نازل کیا پھر ہم نے طرح طرح کی سبزیاں نکالیں۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (5)

زمین وآسمانوں کا بنانے والا، تمھارے لیے تم میں سے جوڑے بنادیے اور

---

(1) القرآن، ۵۱:۴۹ (2) ایضاً، ۵۵:۵۲

(3) ایضاً، ۴۳:۱۲ (4) ایضاً، ۲۰:۵۳

(5) ایضاً، ۴۲:۱۱

جانوروں میں سے، بکھیرتا ہے تم کو اسی طرح اس جیسا کوئی نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ زوج کی صورت میں تخلیق کائنات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہارنعمت ہے، اور اس کائنات کی بقااور سلامتی کا دارومدار ان ازواج کے درمیان توازن اور اعتدال پر ہے۔ نظام شمسی سے لیکر ایٹم تک کا وجود تب قائم رہ سکتا ہے جب ستاروں اور سیاروں، الیکٹران اور پروٹان کے درمیان اعتدال اور توازن ہو اور یہ سب اپنے اپنے دائرہ کار میں مصروف عمل ہو۔

انسان بھی اس کائنات کبیر کا ایک حصہ یعنی کائنات صغیر ہے، اور مرد وزن میں تقسیم ثنویتی وجود رکھتا ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی فطری اور طبیعی قوانین کے ساتھ اس وقت ہم آہنگ ہو کر اعلیٰ وارفع مقاصد کی حامل ہوسکتی ہے جب مردوزن کے رویوں میں توازن اور متعین فطری اور طبیعی دایرہ کار میں مصروف عمل ہو۔

علمائے بشریات کے مطابق انسان کی ابتدائی زندگی سادہ تھی۔ سماجی لحاظ سے مردوزن میں کوئی فرق نہیں تھا۔ شکار کرنا مرد کی ذمہ داری تھی جبکہ عورت کی ذمہ داری خانگی امور سے متعلق تھی۔ بعد میں جہاں معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کی بناء پر انسان کی سوچ وفکر، عقائد اور رسوم درواج میں تبدیلی رونما ہوئی وہاں مردوزن کے رویوں اور دائرہ عمل میں بھی تبدیلی آئی۔ انسانی معاشرہ دو نظاموں پدرسری اور مدرسری میں بٹ گئی۔ شکار گیر معاشرہ جسمیں مردوزن کا سماجی رتبہ برابر تھا، سے باغبان معاشرہ کی پیش قدمی کے نتیجے میں مدرسری نظام کی ابتداء ہوئی، جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عورت نے اپنی فطری تولیدی نظام پر قیاس کرکے زمین سے بیج اگانے کا راز معلوم کر لیا ہوگا،(1) ''مقدس ماں'' اور ''دھرتی ماں'' کی اصطلاحات مدرسری نظام کی نشاندہی کرتے ہیں، تاہم زرعی معاشرہ میں بدوی زندگی سے شہری زندگی کی ابتداء، نجی ملکیت اورضرورت سے زائد اشیاء غلہ مال مویشی وغیرہ کی پیداوار، سیاسی زندگی میں ترقی اور سیاسی اداروں شہنشایت وغیرہ کے آغاز سے انسانی معاشرہ میں پدرسری نظام رائج ہوگیا۔ اسوقت سے لیکر طلوع اسلام تک مردوزن کے تعلقات اور رویے عدم توازن کے شکار رہے۔

اسلام چونکہ فطری دین ہے۔ اسلامی عقائد اوراعمال کی وجہ سے انسان کی فکروعمل انفرادی اور اجتماعی زندگی فطری اور طبیعی قوانین کی ساتھ ہم آہنگ ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں انسان یعنی کائنات صغیر کائنات کبیر کا تکوینی حصہ کے ساتھ ساتھ شعوری اور اردی طور پر بھی اس کا حصہ بن جاتا ہے۔ جوکہ انفرادی اور اجتماعی، سماجی اور معاشرتی استحکام کی ضمانت ہے۔ جبکہ الٰہی سنن اور قوانین سے روگردانی کی صورت میں انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر تنگی اور دباؤ کاشکار بن جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں

عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (2)

یعنی جو میرے ذکر سے روگردانی کرے گا اس کی زندگی بہت تنگی اور

---

(1) مصنف نا معلوم، ڈٹولنے ارتقا، ص ۲۵ (2) القرآن، ۲۰:۱۲۴

دباؤ میں بسر ہوگی۔

اسلامی تعلیمات میں فرد، خاندان، معاشرہ اور تمام نوع انسان کو اخلاقی بنیادوں پر دیکھا جاتا ہے۔ جنسی تفریق کسی بھی جنس کے لیے نہ تو باعث افتخار اور نہ باعث ندامت۔ اس لیے جب اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت کے بارے میں بات کی جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام میں مردوں کے لیے حدود وقیود نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں انسانی شرف، فضیلت اور برتری کا معیار جنس ونسب نہیں بلکہ تقوی ہے، تاہم معاشرتی تقابل اور موازنہ کیلئے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کے حقوق وفرائض اور سماجی رتبے کی وضاحت کی جائے۔ لیکن اس سے پہلے ماقبل اسلام کے تہذیبوں اور معاشروں میں عورت کے مقام کا مختصر جائزہ لیا جائے گا، ہندی، یونانی، رومی اور عرب معاشرے بطور مثال پیش کئے جائیں گے۔

ہندو دھرم میں عورت اور شودر دونوں کو نردھن یعنی مال سے محروم کہا گیا ہے، جبکہ منوشاستر میں بتایا گیا ہے کہ عورت کا وجود صرف اس لئے ہے کہ بچے دیں، ان کی پرورش کریں اور ہرروز خانہ داری کے کام میں مصروف رہیں۔ (1) اس لئے ہندی معاشرہ کی تشکیل میں عورتوں کا حصہ بہت کم رہا ہے۔

ہندو مذہب اور معاشرہ میں عورت چونکہ فطری طور پر ناپاک، قوت اور ویدوں کے علم سے محروم ہے اس لیے عورتوں کے لیے مقدس کلمات سے متعلق کوئی رسم ادا نہیں کی جاتی تھی۔ عورت بچپن میں اپنے والد، جوانی میں اپنے خاوند اور بڑھاپے میں بیٹوں کی زیر حفاظت ہوتی تھی۔ عورت کبھی آزادانہ زندگی گزارنے کی قابل نہیں ہوتی۔ منو کے مطابق اپنی متلون مزاجی اور سنگ دلی کے باعث عورتیں مروں سے بے وفائی کا ارتکاب کرتی ہے، مالک مخلوق نے انکی تخلیق کرتے ہوئے انکی مزاج میں جو داخل کردیا ہے، اسے جانتے ہوئے ہر مرد کو پوری سختی سے عورت کی نگرانی کرنی چاہئے۔ (2)

یونانی معاشرہ میں بھی عورت کی حالت ہندی معاشرہ سے بہتر نہیں تھی، یونانی عورتیں ہمیشہ باپ، بھائی، شوہر یا خاندان میں کسی اور مرد کے ماتحت رہتی تھیں، شادی میں اس کی مرضی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی اور اسکو ہمیشہ اپنے والدین، شوہر، مالک یا کسی اجنبی مرد کی مرضی اور حکم کی تعمیل کرنی ہوتی تھی (3)

رومی قانون اور معاشرہ میں بھی عورت کا درجہ نہایت پست رکھا گیا تھا۔ خاندان کے سربراہ، جو باپ یا شوہر ہوتا تھا، کو اپنی بیوی اور بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا۔ وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا۔ جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم مطلق نہیں تھی، باپ کو اپنی بیٹی پر اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی

---

(1) منو، منودھرم شاستر اردو ترجمہ ارشد رازی، باب ۹، ۱۵ تا ۱۸

(2) ایضاً

(3) غلام رسول، چودھری، پروفیسر، اسلام کا عمرانی نظام، علم عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور، ۲۰۰۴، ص ۶۵

لڑکی کا بیاہ کرسکتا تھا اور اس کو توڑ بھی سکتا تھا۔ (1)

مصری معاشرہ میں بھی عورت کا مقام نہایت پست تھا۔ مصری فراعنہ کے حرم میں بے انتہا عورتیں ہوتی تھیں۔ اکثر وہ اپنی سگی بہنوں سے شادی کرتے تھے جبکہ کبھی کبھی اپنی بیٹیوں سے بھی۔ محرمات کے اندر صرف سگی ماں داخل ہوتی تھی۔ بادشاہوں کے حرم میں ان شرفاء کی بیٹیاں بھی شامل ہوتی تھیں جو تحفۃً بادشاہ کے پاس بھیجی جاتی تھیں۔ اسی طرح حمورابی کی قانون میں عورت جانوروں کی طرح بے زبان ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ کوئی کسی کی لڑکی کو قتل کردیتا تھا تو اس کے بدلے میں اپنی لڑکی دے سکتا تھا، جسے وہ قتل کردیتا تھا یا معاف کردیتا تھا۔ (2)

عرب معاشرہ میں بھی عورت کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی، سماجی لحاظ سے عورت کو صرف جنسی خواہش کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، زنا اور فسق وفجور عام تھا اور اس پر فخر کیا جاتا تھا، ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت علی الاعلانیہ زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چوری چھپے کرنے کو جائز سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا زنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں۔ فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں اور صاحب الریات کہلاتی تھیں. ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ (3) بڑے بڑے رؤسا لونڈیوں کو حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعے کمائیں اور ان کی نذر کریں۔ جس کی قرآن نے ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ اپنے لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔ (4)

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی چند اور قسمیں تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں، مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر مرد کے پاس اپنی بیوی بھیجتا کہ اولاد میں وہی صفات آجائیں دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند مرد بیک وقت کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہمبستر ہوتے. تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے ہاں اولاد پیدا ہوتی تو قیافی شناسی سے اس کا باپ معلوم کیا جاتا. اس کے علاوہ عارضی اور مدت معینہ کے لئے نکاح کی اجازت تھی۔ (5)

نکاح کی کوئی حد نہیں تھی۔ غیلان بن سلم ثقفی جب اسلام لائے تو انکی دس بیویاں تھیں۔ وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا تو آٹھ بیویاں انکے عقد نکاح میں تھیں۔ (6) دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے، باپ

---

(1) غلام رسول، چودھری، پروفیسر، اسلام کا عمرانی نظام، علم عرفان پبلشرز اردو بازار لاہور، ص ۶۰

(2) ایضاً، ص ۶۵، ۶۶

(3) صحیح البخاری، ج ۳، کتاب النکاح، ص ۴۴۷

(4) القرآن، النور، ۲۴:۳۳

(5) صحیح البخاری، ج ۳، کتاب النکاح، ص ۴۴۷

(6) امام ابو داؤد۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، ص ۱۹۹

مرجاتا تو اس کی تمام بیویاں سوائے حقیقی ماں کے اولاد نرینہ کے تصرف میں آتیں، اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔ طلاق کے لیے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے عورت اس کے پاس رہ سکتی تھی کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی تھی، میراث میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ عربوں کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہے۔ اسی بناء پر چھوٹے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے، بیوہ عورت کو ایک سال تک تنگ کوٹھری اور خراب سے خراب تر کپڑوں میں رہنا پڑتا، اسکے بعد گدھے سے جسم کو مس کر کے باہر نکلتی اور قدیم حالت قائم ہوتی۔ (1) عورت کا مہر باپ کو ملتا عورت کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔

مختصر یہ کہ بحیثیت مجموعی عورت بدترین مخلوق تھی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو سخت رنج ہوتا۔ شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا، اور اسے قتل کرنے یا زندہ دفن کرنے کے بارے میں منصوبے بناتا جس سے دختر کشی کی رسم جاری ہوگئی۔

اسلام نے جہاں دوسرے انسانی افکار وعقائد اور معاشرتی ومعاشی کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے انسانی فکروعمل کو جادۂ مستقیم پر لگا دیا وہاں نوع بشر کی دو اصناف مرد وزن کے باہمی تعلقات اور رویوں میں اعتدال اور توازن پیدا کیا۔ قرآن نے سب سے پہلے بتایا کہ مرد کی طرح عورت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور یہ کہ مرد وزن ''نفس واحد'' سے پیدا کیے گیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (2)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائے۔

مرد وزن کی ایک جان سے پیدائش اور ان کے درمیان باہمی مساوات کی تلقین کرتے ہوئے مزید فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ (3)

---

(1) امام ابو داؤد۔ سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، ص ۲۲۴

(2) القرآن، ۴:۱ (3) القرآن، ۷:۱۸۹

وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ تم اس کے پاس آرام پاسکو، پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا، حمل رہا ہلکا سا حمل تو اس کے ساتھ چلتی پھرتی رہی پھر جب بوجھل ہو گئی تو دونوں نے اپنے رب کو پکارا کہ تم ہم کو صالح (اولاد) بخشے تو ہم تیرا شکر ادا کریں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ(1)

اور اللہ نے تمھارے لئے تمھاری ہی قسم سے عورتیں پیدا کیں، اور تم کو تمھاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے دیئے اور تم کو کھانے کی صاف ستھری چیزیں دیں۔

قرآن مجید کے انہی تعلیمات کے نتیجے میں عورت کا سماجی اور معاشرتی رتبہ متعین کر دیا۔ عورت کو فساد کی جڑ، فطری اور پیدائشی ناپاک روح کی بجائے اشرف المخلوقات انسان کی صنف قرار دے کر مرد کے برابر اور مساوی درجہ دیا گیا۔ اسکی وضع حمل کی تکلیف سزا کی بجائے اولاد پر احسان قرار دے کر اولاد کو بالخصوص ماں کی اطاعت اور فرمانبرداری کی تلقین کی گئی۔

اسلام نے عورت کو روحانی اور دینی فرائض کی بجاآوری میں مرد کے برابر قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ عورت کو معاشی اور معاشرتی حقوق دیکر اس کا فطری اور طبیعی رتبہ بحال کیا۔ روحانی اور دینی حقوق وفرائض کے حوالے سے قرآن نے صاف طور پر بتایا کہ مرد وزن برابر اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ اچھے اعمال کا بدلہ ہر مرد وزن کو جنت کی صورت میں جبکہ برے اعمال کا نتیجہ دوزخ کی زندگی کی صورت میں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

كُلُّ نَفْسٍ ۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (2)

ہر ایک نفس اپنے کئے کے کاموں میں پھنسا ہوا ہے،

یعنی بغیر مرد وزن کے تخصیص کے، جو بھی کوئی عمل کرے گا اسکو اس کے مطابق جزا یا سزا ہوگی۔ ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ

---

(1) القرآن، ۱۶:۷۲ (2) القرآن، المدثر، ۷۴:۳۸

حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (1)

جس نے نیک کام کئے مرد ہے یا عورت اور وہ ایمان پر ہو تو اس کو ہم ایک اچھی زندگی دیں گے اور ان کو بہتر کاموں پر جو وہ کرتے تھے ان کا حق اور بدلہ دیں گے۔

نیک عمل اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا اچھا بدلہ ہر انسان کو ملے گا اس میں کسی بھی جنس کی تفریق یا امتیاز نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (2)

پھر ان کے رب نے انکی دعا قبول کی کہ میں کسی محنت کرنے والے کا محنت ضائع نہیں کرتا تم میں سے مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہو۔

انہی اسلامی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ انسانی عمل کی بنیاد جنس پر نہیں بلکہ ایمان اور نیت وارادہ پر ہے اور ہر انسان کو عمل کا بدلہ برابر طور پر ملے گا۔

اس کے علاوہ قرآنی آیات میں یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ جنت میں آدم کی لغزش کی ذمہ دار عورت نہیں تھی، دونوں برابر کے شریک تھے (3) بلکہ ایک اور جگہ تو صرف آدمؑ کو اکیلا ہی اس کا ذمہ دار ٹھرایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (4)

پھر شیطان نے اس کے دل میں، کہا کہ اے آدم میں تجھ کو سدا رہنے والا اور نہ ختم ہونے والی بادشاہی کا درخت بتاوں؟

اس کے برعکس انجیل کی تحریف شدہ تعلیمات کے مطابق ''شجر ممنوعہ'' کی حرص عورت نے کی تھی، سب سے پہلے گناہ اس سے سرزد ہوا تھا اس لئے پیدائشی گناہ گار ہے۔ (5)

دینی فرائض اور عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی کے سلسلے میں مردوزن میں کوئی فرق

---

(1) القرآن، ۱۶:۹۷ (2) ایضاً، ۳:۱۹۵

(3) ایضاً، ۲:۳۶ (4) ایضاً، ۲۰:۱۲۰

(5) عہد نامہ قدیم، پیدائش، باب ۳، ۱ تا ۲۱

نہیں۔ بعض موقعوں پر عورت کو مرد کے مقابلے میں زیادہ سہولت حاصل ہے جس طرح ایام حیض ونفاس میں عورت سے نماز اور روزہ کی ذمہ داری اٹھادی گئی ہے۔ حمل کے دوران یا بچے کی شیر خوارگی کے زمانے میں بھی اگر عورت کو یا اس کے بچے کو خطرہ لاحق ہو تو وہ روزہ سے مستثنیٰ قرار پائی ہے۔ عورت نماز پنجگانہ اور نماز جمعہ وغیرہ کے لئے مسجد جا سکتی ہے لیکن یہ اس کے لئے اختیاری ہے لازمی نہیں اسلئے کہ عورت کے لئے بچوں کی پرورش اور نگہداشت اور تربیت بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

معاشرتی پہلو سے اسلام نے عورت کو بیٹی، بہن بیوی اور ماں کے حقوق دئے ہیں، اور عورت کی فطری شرف اور فضیلت برقرار رکھی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کو ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کی حیثیت سے بڑا رتبہ حاصل ہے، اور اس کے ہر قسم کے حقوق کی تحفظ کی گئی ہے۔ اسلام نے بیٹی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دیکر بیٹے اور بیٹی کا فرق مٹادیا۔ عربوں میں جاری دختر کشی کی رسم کا خاتمہ کرکے اس کو بدترین جرم قرار دیا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْo بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ(1)

اور یاد کرو جب زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی؟

اس کے علاوہ ہندی اور مصری معاشروں میں جاری ''ستی'' اور لڑکیوں کی قربانی'' جیسے رسوم کا خاتمہ کردیا اور بتایا کہ یہ تمام رسوم قتل عمد کے برابر اور قابل مواخذہ ہیں۔ انسانی جان کی حرمت میں مرد وزن کا کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نبی کریم ﷺ کی مجلس میں حاضر تھے آپؐ نے ہم سے فرمایا ہم سے اس بات پر بیعت کرو کہ تم کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھراؤ گے، چوری نہیں کروگے، بدکاری نہیں کروگے اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگے، جو اس عہد کو پورا کرے گا اس کا معاوضہ اللہ تعالیٰ پر ہے اور اگر کسی نے ان میں کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا اور اگر اس کا یہ گناہ مخفی رہا تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے بخش دے اور چاہے عذاب دے۔ (2) آپؐ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی، کنجوسی کرنے اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے۔ (3)

انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جب ادائے عمرہ کے موقع پر مکہ سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا

---

(1) القرآن، ۸۱:۸، ۹

(2) امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب الایمان، ص، ۱۰۵ (۱۸:۹:۲)

(3) امام بخاری، صحیح بخاری، کتاب لادب، ص، ۲۴۷ (۵۶۳۰:۶:۸۱)

تو حمزہ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی ہوئی آئی تو حضرت علیؓ نے اٹھا کر حضرت فاطمہؓ کے حوالے کیا کہ یہ تمھارے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ نے دعویٰ کیا کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے کہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور میرے گھر میں اسکی خالہ ہے۔ حضرت زیدؓ نے دعویٰ کیا کہ حمزہ میرے دینی بھائی تھے اس لئے یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہئے۔ حضرت علیؓ کا دعویٰ کا تھا کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میرے گود میں آئی ہے، نبی کریم ﷺ نے اس خوش کن منظر کو دیکھا اور سب کے مساوی دعوے دیکھ کر اس کو خالہ کی گود میں دیدیا اور فرمایا کہ خالہ ماں کی طرح ہوتی ہے۔ وہی جنس جس کی ہستی پہلے شرم وعار کی موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑتا اور لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا، اسلامی معاشرہ میں اس رتبے پر پہنچ گئی کہ بیک وقت اسکی پرورش کے لئے کئی افراد تیار رہتے، اور فیصلہ مشکل ہوتا، وہی بیٹی جو پہلے مصیبت تھی، آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئی۔

اسلامی معاشرہ میں عورت کو بیوی کی حیثیت سے بھی فطری درجہ دیا گیا ہے۔ اسلام میں نکاح کی بنیاد باہمی محبت، امن، سکون، اصلاح اور عفت پر رکھی گئی ہے، قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ نکاح کا مقصد پاکدامنی اور عفت ہے نہ کہ شہوت رانی۔ (1) چنانچہ زن وشوہر کے باہمی اخلاص ومحبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں ایک نشانی قرار دیا ہے۔ (2)

اسلام سے پہلے عربوں میں دستور تھا کہ مرد قسم کھالیتے تھے کہ اپنی بیویوں کیساتھ نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، قرآن مجید میں ایسی قسم جس میں بیوی سے حسن سلوک نہ کرنے کا عہد ہو، منع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ (3)

اور اللہ کو اپنی قسموں کا ذریعہ نہ بناؤ کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ کرنے کا،

اسلام نے عورت قدر ومنزلت میں اضافہ کرکے قانونی طور پر مردوں کے دوش بدوش کھڑا کیا اور آپس کے قانونی حقوق میں برابر کا درجہ دیا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ص وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (4)

---

(1) القرآن، ۳۰:۲۱ (2) ایضاً، الروم، ۳۰:۲۱

(3) ایضاً، ۲:۲۲۴ (4) ایضاً، ۲:۲۲۸

اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا کہ مردوں کا
عورتوں پر ہے اور ان پر (مردوں کا) ایک درجہ ہے۔

قرآن میں مردوں کے جس درجہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی برتری، شرف یا فضیلت کا نہیں بلکہ انتظامی امور اور بعض خوبیوں کی بناء پر ہے جیسا کہ انبیاء کرام کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے (1) انبیاء کرام نبوت اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہونے کے ناطے سب آپس میں برابر ہیں تاہم بعض خوبیوں اور صفات کی بناء پر ایک کو دوسرے پر فضیلت دی گئی ہے اسی طرح مرد وزن انسان اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے کی سبب برابر ہیں تاہم معاشرتی اور سماجی ضروریات کے تحت خوبیوں اور صلاحیتوں میں تفاوت ہے جس سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

عورت کو شادی کی تجویز قبول کرنے یا مسترد کرنے کرنے کا پورا اختیار دیا گیا ہے۔ عقد نکاح میں عورت کی رضامندی بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر والدین یا سرپرست عورت کی شادی طے بھی کر لے تب بھی عورت چاہے تو اسے فسخ کرسکتی ہے۔ حضرت خنساء بنت خذام انصاریہؓ کہتی ہے کہ میں ثیبہ تھی اور میرا نکاح میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف کردی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، نبی کریم ﷺ نے میرا نکاح رد کردیا۔ (2) ایک اور روایت میں ہے کہ ایک کنواری لڑکی نے نبی کریم ﷺ کے پاس آکر کہا کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے بغیر نکاح کردیا ہے، نبی کریم ﷺ نے اس کو اختیار دیدیا۔ (3) اسلام نے عورت کو شادی کے موقع پر مہر لینے کا حق دیا جو اس سے پہلے والدین یا سرپرست کا حق تصور کیا جاتا تھا۔ مہر عورت کی حقیقی یا علامتی قیمت نہیں، جیسا کہ دوسرے مذاہب اور معاشروں میں خیال کیا جاتا تھا، بلکہ یہ شوہر کی طرف سے محبت اور الفت کا تحفہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جہاں زن وشوہر مساوی قانونی اور روحانی حقوق رکھتے ہیں وہاں انسان کی فطری اور طبیعی ساخت اور بناوٹ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذمہ داریوں کی تقسیم کی ہے۔ مرد کے ذمہ عورت اور گھر بار کی حفاظت اور معاشی کفالت ہے جبکہ عورت خانگی امور اور اولاد کی تربیت کی ذمہ دار ہے۔ اسلام کی یہ تقسیم کار عین انسانی فطرت کے مطابق ہے اور اس سے کوئی جنسی امتیاز مقصود نہیں، قرآن میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ خانگی معاملات باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے طے ہونے چاہئے۔ (4)

اسلامی تعلیمات کے مطابق نکاح مرد وزن کا آپس میں الفت ومحبت کے جذب ہونے کا نام ہے اور اس

---

(1) القرآن، ۲:۲۵۳

(2) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب ''اذا زوج ابنۃ وھی کارھۃ فنکاحہ مردود'' ج ۳، ص ۱۵۷

(3) سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب ''فی البکر یزوجھا ابوھا ولا یستامرھا''، ج ۲، ص ۱۴۱

(4) القرآن، آل عمران، ۳:۱۵۹ اور الشوریٰ، ۴۲:۳۸

کا مقصد سکون وآسائش کی زندگی بسر کرنا ہے تاہم انسانی فطرت میں اختلاف اور دسرے اسباب کے بنیاد پر اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو اسلام نے ان کو علیحدگی کا راستہ بھی بتایا ہے جس میں توازن اور اعتدال ہے۔ مرد وزن جس طرح نکاح کے موقع پر قبول یا رد کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اسی طرح اسلام نے یہ معاہدہ ختم کرنے کا اختیار بھی دونوں اصناف کو دیا ہے، مرد جب یہ اختیار استعمال کرتا ہے تو اس کو ''طلاق'' اور عورت کی علیحدگی صورت میں ''خلع'' کا نام دیا جاتا ہے، اسلام سے پہلے مردوں کو تو اختیار تھا کہ جب چاہے شادی کرلے اور جب چاہے عورت کو چھوڑ دے لیکن عورت کے لئے علیحدگی کا کوئی راستہ نہیں تھا، اسلام نے دونوں کو برابر کا حق دیکر بتایا کہ عورت جب چاہے مرد سے معاملات طے کرکے خلع کرسکتی ہے، اگر مرد انکار کرلے یا ایذا رسانی کی کوشش کرے تو عورت قانونی چارۂ جوئی کرکے عدالت کے ذریعے خلع کرسکتی ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَاللّٰهِ، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَاللّٰهِ، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (1)

تمھارے لئے حلال نہیں کہ جو کچھ تم اپنی بیویوں کو دے چکے ہو اسمیں سے کچھ بھی واپس لے لو، مگر یہ کہ یہ خوف ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود پر نہ رہ سکیں گے تو ایسی صورت میں جبکہ یہ خوف ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حقوق پر قائم نہ رہ سکیں گے تو کچھ مضائقہ نہیں کہ اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقد نکاح سے آزاد ہو جائے۔

طلاق اور خلع کے سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ جو شوہر طلاق دیتا ہے وہ بیوی پر حق مہر اور نان ونفقہ کی صورت میں خرچ مال ودولت سے دستبردار ہوتا ہے، دوسری طرف عورت پر لازم ہے کہ علیحدگی کی صورت میں شوہر کو مہر کی رقم واپس کرے، کیونکہ نکاح ایک معاشرتی معاہدہ کے ساتھ ساتھ ایک معاشی معاملہ بھی ہے۔ لہٰذا مرد نکاح کے بعد مہر اور نفقہ کی صورت میں عورت کی معاشی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے، طلاق کی صورت میں اس خرچ شدہ مال ودولت سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہے، جبکہ خلع کی صورت میں عورت ان معاشی فوائد سے محروم ہو جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ میں عورت کو ماں کی حیثیت سے بھی بلند اور اہم مقام حاصل ہے۔ قرآنی آیات کی رو سے حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد میں سب سے پہلا درجہ ماں کا ہے، ماں کی خدمت، اطاعت اور رضامندی گناہوں

(1) القرآن، ۲:۲۲۹

کی مغفرت اور اللہ کی رضا کی حصول کا ذریعہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ خدا کے نزدیک کونسی عمل زیادہ پسند ہے؟ فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد؟ فرمایا والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا (1) ایک موقع پر کسی نے نبی کریم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کیا، پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ (2) ایک دن نبی کریم ﷺ نے چار گناہوں کا ذکر کیا اور ان میں سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمھارے رب نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے۔ (3) ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بڑا گناہ کیا ہے کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا، کیا تیری ماں زندہ ہے اس شخص نے جواب دیا کہ نہیں آپؐ نے پھر دریافت کیا کہ تیری خالہ زندہ ہے اس نے کہا کہ ہاں، تو آپؐ نے فرمایا کہ تو اس کے ساتھ نیکی کر۔ (4) اس کے علاوہ کے قرآن نے دو بہنوں سے ایک وقت میں نکاح کا خاتمہ کرکے عورت کی نفسیاتی اور معاشرتی کمزوریوں کا ازالہ کردیا۔

عورت کو معاشی تحفظ بھی دی گئی۔ اسلام سے پہلے معاشروں میں عورت جائداد نہیں رکھ سکتی تھی۔ میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ زمین وآسمان میں جو کچھ بھی ہے اس کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے (5) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا اور زمین وآسمان سب اس کے لئے مسخر کئے، (6) چونکہ قرآن میں انسان کو مخاطب کیا گیا ہے اور انسان دو اصناف پر مشتمل ہے اس لئے قرآنی آیات کی رو سے مرد وزن کائنات کے مادی وسائل پر برابر حق تصرف رکھتے ہیں۔ اس طرح اسلامی معاشرے میں صنفی امتیاز کا خاتمہ کردیا گیا کیونکہ صاحب جائداد لوگوں کو معاشرے میں عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جبکہ جائداد اور ملکیتی حقوق نہ رکھنے والوں کو طفیلی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ شریعت نے عورت کو شادی سے پہلے اور شادی کے بعد مکمل ملکیتی حقوق دئے ہیں وہ جب چاہے جائداد کی خرید وفروخت کرسکتی ہے معاشی تحفظ کے طور پر نکاح کے وقت مہر کی رقم وصول کرسکتی ہے جس کی کوئی حد مقرر نہیں۔ شادی شدہ عورت پر یہ پابندی نہیں کہ وہ گھریلوں اخراجات ذاتی آمدنی پوری کرے۔ اس لئے کہ یہ مرد ذامہ داری قرار دی گئی ہے۔ البتہ ضرورت کے وقت باہمی مشورے اور رضامندی سے خرچ کرسکتی ہے طلاق کی صورت میں بھی عدت کی مدت تک معاشی کفالت مرد کی ذمہ

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب الادب، ص۲۴۳

(2) ایضاً

(3) ایضاً، باب عقوق الوالدین من الکبار، ص۲۴۶

(4) امام ترمذی، جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، ص۲۶۵

(5) القرآن، ۲:۲۸۴ (6) ایضاً، ۲:۳۰، ۳۱

داری ہے۔ اسی طرح بچوں کی کفالت بھی ماں پر نہیں بلکہ باپ پر ہے۔

عورت بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے میراث میں حصہ دار ہے۔ بیٹی کی حیثیت سے باپ کی جائیداد میں بیٹے کے مقابلے میں نصف اور بیوی کی حیثیت سے شوہر کی میراث میں آٹھواں حصہ وصول کر سکتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میراث میں عورت کی نسبت مرد کو زیادہ حصہ دیا گیا ہے لیکن مالی وسائل کی یہ تقسیم بھی معتدل اور متوازن ہے۔ اس لئے کہ عورت پر خرچ کی ذمہ داری کم ڈالی گئی ہے اور اس کے لئے مراعات زیادہ ہیں، اس کے علاوہ عورت کو ایک جانب باپ اور دوسری طرف شوہر کی میراث میں حصہ دیا گیا ہے باوجود اسکے کہ اسلامی قانون میں شادی سے پہلے اور شادی کے بعد عورت کے تمام تر اخراجات کا بوجھ مرد پر ڈالا گیا ہے عورت قانونی طور پر کسی قسم کی خرچ کی پابند نہیں۔ مختصر یہ کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کو جو معاشی تحفظ حاصل ہے وہ کسی اور معاشرہ میں نہیں۔

اسلامی قانون میں مرد وزن کا رتبہ برابر ہے۔ اسلامی معاشرہ میں حصول انصاف کی راہ میں جنسی تفریق کوئی رکاوٹ نہیں۔ قرآنی آیات کے مطابق مرد وزن کسی بھی جرم، مثلاً چوری(1)، زنا(2)اور قتل(3) وغیرہ، کا ارتکاب کرلے تو دونوں اصناف کے لئے سزا برابر ہے، البتہ معاشی معاملات میں عورت کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، اسکے علاوہ اسلامی قانون میں عورت کو گواہی کا حق حاصل ہے جس میں عام اصول کے مطابق دو عورتیں ایک مرد کے برابر سمجھی جاتی ہیں۔

عورتیں معاشرتی، سماجی اور سیاسی امور میں بھی بھرپور حصہ لے سکتی ہے۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ معاشرتی اور سماجی برائیوں کے خلاف جدوجہد ہر مسلمان مرد وزن پر لازم ہے، نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا ہر مسلمان مرد وعورت کا مذہبی اور دینی فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ مومن مرد وزن ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ (4) یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عورتیں جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ آپؐ کے بعد جب خلفائے راشدین کا دور آیا تو بھی عورتیں سیاسی اور معاشرتی امور میں شریک مشورہ ہوتی تھیں۔ عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں جب ایک مرتبہ انھوں نے حد مہر مقرر کرنا چاہا تو ایک عورت نے برسر عام اسکو ٹوک دیا اور بتایا کہ جب نبی کریم ﷺ نے حد مقرر نہیں کی ہے تو آپ کس طرح مقرر کر سکتے ہیں جس پر عمر فاروقؓ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ عمر غلطی پر تھا اور عورت ٹھیک تھی۔ (5)

---

(1) القرآن، ۳۸:۵ (2) ایضاً، ۲:۲۴ (3) ایضاً، ۱۷۸:۲ (4) ایضاً، ۷۱:۲

(5) ابن جوزی، جمال الدین ابو الفرج، ، حیات فاروق اعظم، ترجمہ وتعلیق، علامہ شاہ حسن عطاء، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۵۲

اسلام نے عورت کو علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنے کا حق دیا ہے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی بناء پر انسان کے لئے لازم ہے کہ تسخیر کائنات کے قوانین سے واقفیت حاصل کرلے۔ یہ حق اور ذمہ داری صرف مرد پر نہیں بلکہ عورت کی بھی ہے اسکے علاوہ دین اور شریعت اور اعمال کے باز پرس کے معاملے میں بھی عورت یکساں طور پر قابل مواخذہ ہے اس لئے دینی اور شرعی علوم کا حاصل کرنا بھی اس پر لازم ہے۔ ایک مرتبہ جب عورتوں نے نبی کریم ﷺ سے مسائل کی تعلیم دینے کیلئے ایک دن مقرر کرنے کی درخواست کی تو نبی کریم ﷺ نے ان کی تعلیم کیلئے دن اوراوقات مقرر کئے تھے۔ (1)

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، ج ا، کتاب العلم، باب ''ھل یجعل للنساء یوم علیٰ حدۃ فی العلم'' ص۱۵۳،

فصل چہارم

اسلام میں غلامی کا تصور اور حقوق

غلامی کے اسباب اور مختلف مذاہب اور انسانی معاشروں میں جاری غلامی کے رواج کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غلامی کا رواج انسانی معاشرہ میں نا معلوم وقت سے چلا آرہا ہے، جس کے دو بنیادی اسباب، خواہش اور جنگ، بتائے جاتے ہیں۔ (1) غلام کو ایک جاندار آلہ اور غلامی کو اس کے بدن کا پیدائشی جزلا ینفک تصور کیا جاتا تھا۔ غلاموں کے بارے میں اصلاحی قوانین کا نفاذ بھی جستہ جستہ ہوتا رہا، تاہم مجموعی طور پر غلامی کا رواج معاشی اور معاشرتی استحکام کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ دین اسلام اور شریعت محمدی ﷺ نے جہاں جمیعت بشری کا فکری اور عقائد وایمانیات میں رہنمائی کر کے جادۂ مستقیم پر لگا دیا، وہاں دوسرے سماجی، معاشرتی اور معاشی اصلاحات کر کے انسان کے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی درستگی کی، جن میں غلامی کا رواج بھی شامل ہیں۔

غلام کیلئے عربی زبان میں ''عبد''، ''خول''، اسیف، اسریٰ اور کنیز یا باندی کے لئے ''امۃ''، جاریہ اور قسۃ وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، غلامی کے مجرد مفہوم کو عبد یا رق کے کسی مشتق سے ادا کیا جاتا ہے، آقا کو ''سید''، مولیٰ یا قانونی زبان میں مالک کہا جاتا ہے، عبد کی ضد حر یا حرۃ ہے۔ ترکی زبان میں غلام کا مترادف ''قول'' (kul) ہے۔ (2)

عربوں عام طور پر دو قسم کے غلام ہوتے تھے زرخرید غلام یعنی عبد مملوک اور خانہ زاد غلام یا ''عبد قن''، بعد میں اس اصطلاح کا استعمال ایسے غلام کیلئے ہونے لگا جس پر مالک کو کامل اور مکمل حقوق ملکیت حاصل ہوں۔ عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ عبد قن کو مالک فروخت کردے یا اپنے آپ سے الگ کردے۔ عربوں میں عام طور پر اکثریت سیاہ فام حبشی الاصل غلاموں کی ہوتی تھی۔ البتہ کچھ سفید فام اور غیر عربی نسل کے غلام بھی ہوتے تھے جن کی تعداد نسبتاً کم ہوتی تھی جو کہ زیادہ تر غارت گری کی صورت میں بدویوں کے ہاتھ پڑ جاتے۔ اس کے علاوہ عربوں میں فدیہ دے کر غلاموں چھڑا لینے کا رواج بھی تھا، تاہم اس امر کا کوئی قطعی ثبوت نہیں کہ قرض کے بدلے لوگوں کو غلام بنایا جاتا تھا یا خاندان کے لوگ اپنے بچوں کو بیچ ڈالتے تھے۔ غیر معمولی اور استثنائی صورت حال کو عام دستور کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ مشرق وسطیٰ کی طرح عربوں میں بھی مالی منفعت کے لئے غلاموں اور خاص کر لونڈیوں سے جبراً اور غیر اخلاقی طور پر فائدہ اٹھانے کو رواج بھی تھا۔

---

(1) Robert, R. The Social Laws of Quran. Williams and Norgate LTD, London, 1925, P. 53.

(2) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲ :۱۴، مضمون غلامی، ص ۵۶۴

اسلام نے غلامی کے اس قدیم اور مضبوط معاشرتی رواج کو یکسر ختم تو نہیں کیا البتہ اس میں ایسی بنیادی تبدیلیاں اور صلاحات کیں کہ اس کا صرف نام ہی غلامی رہ گیا باقی معاشرتی اور سماجی زندگی میں ان کا درجہ عام آزاد انسانوں کے برابر کر دیا۔ اس کے علاوہ جنگی قیدیوں کے استثنائی صورت کے بغیر غلام بنانے کی ممانعت کی۔ حریت غلامی کے وسائل میں بے پناہ اضافہ کیا گیا۔ عبدیت کی بجائے حریت کو اصل تسلیم کیا گیا اور مخصوص صورت حال کے پیش نظر صرف اباحت کی حد تک اجازت دیدی گئی۔ آئندہ سطور میں غلامی کے رواج کا قرآن و حدیث کی روشنی میں جائزہ لیا جائیگا، سب سے پہلے ان قرآنی آیات کی، جن میں غلامی کا ذکر ہے، تفصیل پیش کی جائے گی اس کے بعد آحادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں غلاموں کے حقوق پر بحث کی جائے گی۔

قرآن میں لفظ ''عبد'' غلامی کے معنی میں صرف ایک بار آیا ہے، سورۂ بقرہ میں قصاص کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (1)

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں (قصاص) برابری کرنا فرض کیا گیا، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔

زیادہ تر ''عبد'' کا لفظ عبادت بندگی، اور ان انسانوں کیلئے آیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو معبود، خالق، اور مالک مان کر اسکے بتائے ہوئے احکامات کے تحت زندگی بسر کر رہے ہوں۔ انبیاء، صلحاء اور مومنین کیلئے عبداللہ اور عبدالرحمٰن کے الفاظ آئے ہیں۔

''رق'' غلامی کے معنی میں ''رقبۃ'' اور ''الرقاب'' کے مشتقات کے ساتھ آٹھ بار قرآن میں آیا جن میں زیادہ تر غلاموں کے آزاد کرانے کی تلقین اور حریت و عبدیت کے وسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ''اسریٰ'' کے موضوع کے تحت قرآن مجید میں چار مرتبہ جنگی قیدیوں کے طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان تمام آیات مبارکہ میں کہیں بھی غلام بنانے کا ذکر نہیں ہے متعدد مواقع پر باندیوں اور غلاموں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے آزاد کرنے کا حکم بھی کئی جگہ ہے۔ ان اسیران حرب کا ذکر بھی کئی مقام پر آیا ہے، اور ان کی نسبت بعض احکام بھی بتائے گئے ہیں لیکن ان سب میں کہیں بھی، کسی بھی موقع پر، کسی عنوان اور کسی بھی ادائے بیان کے ساتھ غلام بنانے کا ذکر صراحۃً نہیں ہے۔ جنگ کے اکثر و بیشتر احکام سورۂ انفال میں مذکور ہیں لیکن اسیران جنگ کی نسبت صرف ایک موقع پر یہ ارشاد ہوتا ہے:

---

(1) القرآن، البقرۃ، ۲:۱۷۸

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ (1)

''نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں قیدیوں کو رکھے جب تک خوب خونریزی نہ کرے''

عام مفسیرین کے مطابق یہ آیت واقعہ بدراور قیدیوں کے اس سلوک سے متعلق ہے جو کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کے مشورہ کے بعد جنگی قیدیوں سے روارکھا تھا۔ اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ غلبہ حاصل نہ ہونے تک مسلمانوں کو فدیہ لیکر یا بغیر فدیہ کے اسیران جنگ کو رہا کرنے کے قصہ میں نہیں پڑنا چاہئے۔ بلکہ قتل وقتال جاری رکھنا چاہئے۔ جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں یہ آیت خاموش ہے۔ اسی سورۃ میں ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ (2)

''اے نبی آپ کے قبضے میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ نے تم میں بھلائی معلوم کی تو وہ تم کو اس سے بہتر دیگا جو تم سے لیا گیا ہے''۔

یہ آیت بھی اسیران بدر سے متعلق ہے لیکن اس سے بھی صاف طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ البتہ سورۂ محمد کی ایک آیت میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (3)

''سو جب تم مقابل ہومنکروں کے تو ماردگردنیں یہاں تک کہ خوب قتل کر چکوتو انکومضبوط باندھ لو قید، پھر یا تو احسان کیجئے یا پھر معاوضہ لے لیں جب تک لڑائی اپنا ہتھیار رکھدے''۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں کیساتھ دوقسم کا سلوک ہوسکتا ہے۔ ان سے فدیہ لیکر رہا کر دیا جائے یا پھر اس کے بغیر ہی انہیں آزادی دیجائے۔ مجموعی طور پر غلامی سے متعلق قرآنی آیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں غلام بنانے کے جواز کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ

---

(1) القرآن، ۸:۶۷ (2) ایضاً، ۸:۷۰ (3) ایضاً، ۴۷:۴

کہیں ''استرقاق'' یعنی غلامی کی ممانعت بھی نہیں ہے۔ قرآن اس معاملہ میں خاموش ہے غلام یا باندی بنانے کی نفیاً یا اثباتاً کوئی صراحت نہیں ہے۔ اس کے بعد احادیث نبویہ اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں غلام بنانے کی اجازت ہے۔ یہ اجازت اباحت کی حد تک ہے اور یہ معاملہ امت مسلمہ کے اجتماعی ارادے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ امت مسلمہ وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کو مدنظر رکھکر یہ فیصلہ کرے گی کہ اسیران جنگ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے چاہے احسان کرلے، فدیہ لے لے، قتل کردے یا غلام بنا لے۔

اسلامی تعلیمات سے مجموعی طور پر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے حکم نہیں دیا ہے اور یہ کہ بعض ناگزیر اور وقتی حالات کے پیش نظر اگر چہ اس کو مباح کہا ہے، لیکن اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ استرقاق ایک وقتی اور ہنگامی چیز ہے، معاشرت، اجتماعی زندگی اور تمدن کا کوئی مستقل عنصر نہیں ہے اس لئے قرآن مجید میں اسکا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔

اسلام میں باوجود تمام تر اصلاحات کے، غلامی کے رواج کو اباحت کی حد تک باقی رکھا گیا اور اس کا کلی طور پر خاتمہ نہیں کیا گیا، اسلام نے اس کا قطعی طور پر خاتمہ کیوں نہیں کیا؟ اس کے چند یہ اسباب یہ تھے:

(۱) اسلام جب دنیا میں آیا تو صدیوں پہلے ہر جگہ غلام بنانے اور رکھنے کا رواج تھا۔ خود عرب معاشرہ اس سے مستثنیٰ نہیں تھا اہل عرب کثرت سے غلام اور باندیاں رکھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ بسا اوقات ان کی لڑائیاں اسی لئے ہوتی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ غلام بنائے جائیں اس امر کا اظہار جاہلی ادب سے بخوبی ہوتا ہے۔ یہ رواج ان کے طرز معاشرت کا اہم جزء بنا ہوا تھا۔ اہل عرب کی طرز معیشت، عام معاشرت اور ان کے تہذیب وتمدن میں نمایاں انقلاب بغیر اس رسم بد کا خاتمہ کرکے ہرگز سودمند نہیں تھا۔ اگر اس عہد کے حالات میں نبی کریم ﷺ یکلخت اس کا استیصال کردیتے تو اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے عرب کو بہت نقصان پہنچتا جس کا ازالہ ممکن نہیں تھا اور بہت ممکن تھا کہ اس سے ملک میں ایک عام بے چینی پیدا ہوجاتی۔ اس وقت کے حالات اور غلامی کے انسداد کا تجزیہ کرتے ہوئے سید امیر علی لکھتے ہیں:

> ''جن لوگوں میں نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے ان زمانے میں رواج غلامی پورے طور پر سرائیت کئے ہوئے تھا، اس زمانے میں اس کی انسداد کی یہی صورت زیادہ موزوں تھی کہ مسلسل طور پر انسانی اور عقلمندانہ قوانین کی اشاعت کی جاتی، اگر یکا یک اس کا انسداد کردیا جاتا تو اخلاقی اور اقتصادی اعتبار سے ایسا ہونا ناممکن تھا۔ لا تعداد قواعد، مثبت اور منفی، غلاموں کی بتدریج آزادی اور انکی خوشحالی کیلئے وضع کئے گئے۔ اگر اس کے خلاف کوئی

اور پالیسی اختیار کیجاتی تو اسلامی جماعت اور معاشرہ کو اس سے بہت بڑا
نقصان پہنچتا جو کہ اسوقت اپنی ابتدائی صورت میں تھی''۔ (1)

اس دور میں کا یکسر خاتمہ نہ صرف معاشی اور معاشرتی حالات کے پیش نظر قابل عمل اور موزوں نہیں تھا بلکہ غلاموں کے لئے بہت بڑی مشکل پیدا ہو جاتی، کیونکہ اس وقت تمام دنیا میں بالخصوص عربوں میں مضبوط قبائلی نظام رائج تھا جس میں کسی ایک قبیلے کا فرد یا اسکا حلیف ہونا نہایت ضروری تھا۔ اس کے بغیر کسی فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تصور ناممکن تھا۔ غلاموں کو اس وقت تک معاشی اور معاشرتی تحفظ حاصل ہوتا تھا جب تک وہ کسی شخص کے غلام ہوتے تھے۔ نسل در نسل غلامی کی زندگی گزار کر غلام اپنی قبائلی شناخت کھو چکے تھے، اس لئے ان کیلئے یہ ناممکن تھا کہ کسی کی غلامی کے بغیر زندگی گزار سکیں۔

(۲) دوسرا سبب یہ تھا کہ اس عہد میں ہر جگہ غلام بنانے کا رواج تھا اگر اسلام اس کو بحالت جنگ بھی جائز قرار دیتا تو اس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچتا۔ لڑائی میں جو مسلمان غیر مسلموں کے ہاتھوں گرفتار ہوتے وہ غلام بنالئے جاتے اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاں جو قیدی ہوتے وہ سب کے سب رہا کردئے جاتے، جس سے مسلمان دوہرے نقصان اور مصیبت کا شکار ہو جاتے ایک یہ کہ ان کے لوگ غلام ہوتے اور دوسری یہ کہ اس سے مسلمانوں کے افرادی قوت میں کمی آجاتی اور دشمن کو فائدہ ہوتا۔ اس لئے اسلام نے صرف جنگ کی حالت میں، توازن برقرار رکھنے کے لئے، غلام بنانے کی اجازت دیدی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روح یہی ہے کہ امت مسلمہ کے اجتماعی نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو حالت جنگ میں بھی اسیران جنگ کو غلام بنانے کی بجائے رہا کردیا جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے مختلف غزوات میں ہزاروں قیدی رہا کردئے تھے۔ (2) ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے اسی مفہوم کو یوں بیان کیا ہے:

''اسلام نے غلامی کو باقی رکھا اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ
اور اس کے دشمنوں میں توازن باقی رہے اور دوسری وجہ یہ کہ اس طرح ان
کمزور عورتوں کی اعانت وحمایت ہو جاتی تھی جن کے مرد لڑائی میں قتل ہو
چکے ہوں۔ اگر ان عورتوں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو انسانی جماعت پر یہ
مصیبت ہو جاتیں اور طرح طرح کے مفاسد کا باعث بنتیں''۔ (3)

(۳) جنگی قیدیوں کے ساتھ کئی طرح کا معاملہ ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ قتل کئے جائیں، یہ صورت بشری حقوق

---

(1) Amir Ali, Syed. The Spirit of Islam. Pakistan Publishing House Karachi, 1984, P. 262.

(2) غزوۂ حنین اور دوسرے غزوات اس کی مثالیں ہیں۔

(3) ابراہیم حسن، ڈاکٹر، تاریخ الاسلام السیاسی،، قاہرۃ، ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۳۱۔

کے حوالے سے نہایت بدترین ہے۔ اس کے باوجود عملی زندگی میں اس کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے اگر ایک فرد کا وجود جمیعت بشری کے لئے مضر اور نقصان دہ ہو تو اجتماعی مفاد کی خاطر اس کو قتل کیا جا سکتا ہے، اس کی مثال اجتماعی زندگی میں قاتل کی ہے جس بارے میں اللہ ارشادفرماتے ہیں کہ قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ (1) تاہم اس کا اطلاق مخصوص اور محدود افراد پر کیا جاسکتا ہے، جمہور پر نہیں۔ رسم و رواج کے طور پر یہ ممنوع اور قبیح ہے۔ دوسری صورت یہ کہ فدیہ لیکر یا بغیر فدیہ کے رہائی دی جائے، یہ صورت عام لوگوں کیلئے قابل عمل ہے، کیونکہ عام طور پر معاشرے کے اکثر افراد اجتماعی زندگی کے خصوصی معاملات سے کم واقفیت رکھتے ہیں۔ تیسری صورت یہ کہ قید خانے میں جنگی قیدیوں کے طور پر رکھے جائیں۔ یہ معاشرتی لحاظ سے زیادہ حساس اور معاشی اعتبار سے زیادہ مہنگا ترین ہے کیونکہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جنگی قیدیوں کا ملکی معیشت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے،۔ چوتھی صورت ان کی غلامی کی ہے۔ یہ مخصوص افراد اور مخصوص حالات کے پیش نظر قابل عمل ہے۔ اس لئے کہ اگر ایک قیدی جو کسی مخصوص صلاحیت یا فن میں ماہر ہے، تو قتل کرنے سے اس کی صلاحیت اور فن ضائع ہوتا ہے جبکہ رہائی کی صورت میں جماعت کو نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کیلئے بہتر یہی ہے کہ اس کو ایک خاص مدت تک صالح ماحول میں رکھا جائے تا کہ اس کی فکری اور نظری کج روی کا ازالہ ہو جائے اس طرح اس کی بہترین صلاحیت بھی ضائع نہیں ہوگی اور اس کا استعمال بھی معاشرے کے فائدے کیلئے ہوگا۔ ان غلاموں کو ذہنی، دماغی تربیت اور ارتقاء کے بکثرت مواقع مل سکتے ہیں بشرطیکہ سماجی نظام میں ان کے ساتھ وحشیانہ اور غیر انسانی معاملہ روانہ رکھا جائے۔ چنانچہ تاریخ کے مختلف ادوار میں جہاں سماجی نظام میں ان کے ساتھ اچھا سلوک برتاؤ کیا گیا ہے تو غلاموں نے معاشرتی اور تمدنی ترقی میں نمایاں کردار آدا کیا ہے۔ خاص طور پر اسلامی تاریخ میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

غلامی کے رواج میں اصلاحات

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام نے غلام اور باندی بنانے کے وہ تمام قدیم طریقوں کو مٹا کر صرف ایک ہی طریقے کو باقی رکھا۔ اسلام سے پہلے غلام بنانے کے مختلف طریقے تھے۔ جن میں فقر وفاقہ کے باعث یا قرض کے دباؤ میں اپنے بچوں کو یا اپنے آپ کو کسی شخص کے ہاتھ فروخت کرنا، کسی جرم کی پاداش، یا قمار بازی میں شرط کی بناء پر غلام بنانے کے رواج کے علاوہ بر دہ فروشی اور زبردستی باندی اور غلام بنالینا وغیرہ شامل تھے۔

---

(1) القرآن، البقرۃ،۲:۱۷۹

اسلام نے غلامی کی ان تمام صورتوں کو سخت ناجائز اور موجب عذاب الٰہی قرار دیا، اور ایک صورت کو باقی رکھا یعنی وہ لوگ جو جنگ میں گرفتار ہو جائیں، امام اور خلیفہ کو اختیار ہے، اگر سیاسی اور معاشرتی حالات کا تقاضا ہو تو ان کو غلام یا باندی بنا لے۔ اس کے علاوہ غلامی کی جتنی بھی صورتیں ہیں، سب کو قطعی حرام اور ناجائز قرار دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اللہ فرماتا ہے کہ تین شخص وہ ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور جن سے میں جھگڑا کروں گا ان پر غالب آجاؤنگا۔ ایک وہ شخص ہے جس نے میرے نام پر دیا اور پھر غدر کیا، دوسرا وہ شخص جس نے کسی حر کو بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا، تیسرا وہ ہے جس نے اجرت پر کسی مزدور کو رکھا اور اس سے اپنا کام تو پورا لے لیا لیکن اس کی مزدوری اسے نہیں دی'' (1)

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تین شخص وہ ہیں جن کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریگا۔ انہی تین میں ایک وہ شخص ہے جس نے کسی آزاد کو غلام بنالیا۔ (2)

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کی آزادی اصل ہے جبکہ غلامی وقتی، ہنگامی اور فروعی چیز ہے۔ قرآنی آیات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور تمام اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہیں،

اس لئے آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے جبکہ غلامی کو محض ایک امر عارض قرار دیا جاتا ہے۔ اس لئے فقہائے اسلام کے نزدیک معروف قاعدہ ''المرء یو خذ با قراره'' کے برعکس اگر کوئی اپنی غلامی کا اقرار کر لے تو اقرار غلامی کی بجائے دوسرے شخص کی دعویٰ آزادی کو ترجیح دی جائیگی۔

غلاموں سے متعلق اسلام کی دوسری اہم اصلاح یہ ہے کہ اس نے غلامی کا تخیل بالکل بدل دیا۔ اسلام سے پہلے غلام کو ایک جسد باروح اور ایک آلہ متحرکہ کہا جاتا تھا، غلامی بدن کا ایک لازمی جزء سمجھا جاتا تھا، اور ان کی حیثیت ایک ذاتی جاگیر اور ایک پالتو جانور سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اسلام نے غلام کو بالکل اس کی آقا کی طرح ایک صاحب حس وشعور انسان مانا ہے، اور مختلف طریقوں سے اس قدیم ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جو غلاموں اور باندیوں کے بارے میں ہر قوم اور مذہب کے افراد میں پائی جاتی تھی۔

اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو عام انسانوں سے متعلق ہیں، اور ان میں غلام بھی داخل ہیں۔ دوسری تعلیمات وہ ہیں جو خاص غلاموں کے متعلق ہیں۔ عام تعلیمات، جن میں غلام اور

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب الاجارۃ، باب ''اثم من منع اجر الاجیر'' ص۳۲ (۴۲:۱۰:۲۱۵۰)

(2) ابی داؤد، براویت فتح الباری جلد۴، ص۲۴۶۔

آزاد دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں، کے مطابق اسلام نے رنگ ونسل اور قوم ووطن کے تمام امتیاز ات کو ختم کر کے تمام انسانوں کو ایک جماعت سمجھا ہے۔ ایک انسان کو کسی دوسرے انسان پر تفوق اور برتری اعمال صالحہ اور ایمان محکم کی وجہ سے تو ہوسکتی ہے، لیکن رنگ ونسل، امارت اور غربت کی وجہ سے نہیں۔

قرآن مجید میں تمام انسانوں کو یکساں مخاطب ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (1)

اے لوگو !ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تم کو مختلف قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کیا ہے یہ اس لئے کہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہوسکو، بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

خطبۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے جمیت بشری کے یکساں حقوق اور برابری کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ أَنْتُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ(2)

بیشک اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور باپ دادوں پر فخر کرنے کو مٹادیا ہے انسان اب یا تو پرہیز گار مومن ہے یا بدنصیب گنہگار، تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔

وہ لوگ جو اپنی تونگری ادر آقائی پر فخر اور غرور کرتے ہیں اور اپنے سے کمزور اور ناتواں انسانوں کو ذلیل وحقیر سمجھنے کے عادی ہیں قرآن انکو خبردار کرتا ہے کہ انسان کو محنت میں بنایا اور پیدا کیا ہے، پھر انسان یہ سمجھتا ہے کہ کوئی اس پر قادر نہیں ہے، یعنی کسی شخص کو اپنی آقائیت کے گھمنڈ میں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کو تو اپنے ماتحتوں اور غلاموں پر قدرت حاصل ہے لیکن خود اس پر کسی کو قدرت اور غلبہ حاصل نہیں ہے۔

اس عام اور وحدت انسانی کی تعلیم میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان سب برابر ہیں۔ ان میں رنگ ونسل اور حاکمیت اور محکومیت، آقائی اور غلامی کا کوئی امتیاز نہیں جس کی بناء پر کوئی شخص دوسرے کے ساتھ غیر مساویانہ اور حقارت انگیز معاملہ کرے۔

---

(1) القرآن، الحجرات، ۴۹:۱۱

(2) امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد، باب تفاخر بالانساب، ص ۶۹۵

اس عام تعلیم کے علاوہ غلاموں کے لئے الگ اور جداگانہ تعلیمات بھی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ غلام تمہارے بھائی ہیں ان کے ساتھ برادرانہ معاملہ کرو۔ معرور بن سوید سے روایت کہ ہم مقام ربدہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے ملے تو دیکھا کہ ان کے بدن پر ایک چادر ہے اور اسی طرح کا ایک چادر ان کا غلام اوڑھے ہوئے ہیں، ہم نے کہا اگر آپ غلام کی چادر بھی خود استعمال کر لیتے تو پورا لباس ہوجاتا اور اس کو کوئی اور کپڑا پہنادیتے۔ آپؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے فرماتے تھے:

''تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے تمہارے قبضہ میں کردیا ہے پس جس کا بھائی اس کے قبضہ میں ہو اسے چاہئے کہ جو خود کھائے وہ اسے کھلائے اور جو خود پہنے وہ اسکو پہنائے اور اس کو ایسے کام کی زحمت نہ دے جو اس کی قوت برداشت سے باہر ہو اور اگر دے تو چاہئے کہ خود اس کی مدد کرے۔''(1)

غلام اپنے آقا کو ''رب'' کہے یا آقا اپنے غلام کو ''عبدی'' کہ کر پکارے تو اس سے فخر وغرور اور امتیازی رویئے کا اظہار ہوتا ہے جس کو نبی کریم ﷺ نے سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی بناء پر آپؐ فرماتے ہیں:

ولا يقولن احدكم عبدى وامتى ولا يقولن الملوك ربى وربتى، وليقل المالك فتاى وفتاتى وليقل المملوك سيدى وسيدتى فانكم المملوكون والرب الله عزوجلّ(2)

تم میں کوئی میرا ''غلام'' یا میری باندی نہ کہے اور نہ غلام میرا ''رب'' کہے، مالک کو میرے ''بچے'' اور میری ''بچی'' کہنا چاہئے اور غلام کو چاہئے کہ میرا ''سردار'' یا مری سردارنی'' کہے کیونکہ تم سب مملوک اور رب تو سب کا اللہ تعالیٰ ہے۔

وسائل حریت اسلامی تعلیمات میں اباحت کی حد تک غلامی کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن ساتھ ساتھ غلاموں کے آزاد کرنے اور کرانے کی بہت زیادہ تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کی اصل حریت ہے نہ کہ عبدیت۔ نبی کریم ﷺ اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، ج۲، کتاب العتق، باب العبید اخوانکم، فاطعموا مما تاکلون، ص۱۸۲

(2) امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الاداب، باب ''لایقول المملوک ربی وربتی'' ص ۶۴۱۔

أَيُّمَا رَجُلٍ أَعْتَقَ امْرَأً مُسْلِمًا اسْتَنْقَذَ اللَّهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنْهُ مِنْ النَّارِ(1)

جو شخص کسی مسلمان کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر جوڑ کے بدلے اس کا ہر جوڑ دوزخ سے آزاد فرمائے گا۔

قرآن مجید کی سورۂ بقرۃ میں جہاں ایمان اور اعمال صالحہ کو بیان کیا گیا ہے وہاں غلام کے آزادی کو نماز اور روزہ سے مقدم رکھا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (2)

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر، اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال کی محبت کے باوجود اس کو خرچ کرے رشتہ داروں پر، یتیموں پر، محتاجو ں پر، اور مسافروں پر اور مانگنے والوں پر اور خرچ کرے گردن چھڑانے پر اور نماز کو قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔

اللہ تعالیٰ اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں :

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ(3)

اور تم کو کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کیا ہے ؟ چھڑانا گردن کا یا پھر بھوک کے دن میں کسی بھوکے کو کھانا کھلانا۔

انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے ہزاروں کی تعداد میں غلام آزاد کرائے، ان ترغیبات کے علاوہ متعدد گناہوں کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ جو لوگ برضا ورغبت غلام آزاد نہیں کرتے ۔ اس دباؤ میں آکر غلام آزاد کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ ان گناہوں میں بعض تو وہ ہیں جن کے

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب العتق، باب ما جاء فی العتق و الفضلہ، ج۲، ص۱۷۱۔

(2) القرآن، ۲:۱۷۷ (3) ایضاً، ۹۰:۱۳ تا ۱۴

کفارہ میں غلام آزاد کرنا مستحب اور افضل بتایا گیا ہے جبکہ بعض ایسی ہیں جن کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا واجب اور ضروری ہے۔

(۱) اگر کوئی کسی مسلمان کو خطاءً قتل کردے تو اس پر ایک غلام آزاد کرانا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا(1)

اور اگر کوئی کسی مسلمان کو خطاً قتل کردے تو اس پر واجب ہے کہ ایک مؤمن غلام کو آزاد کردے اور مقتول کے ورثا کو دیت دیدے مگر اس وقت جبکہ وہ معاف کردے۔

پھر مسلمان کی بھی تخصیص نہیں ہے بلکہ کسی ذمی یا معاہد کو بھی اگر غلطی سے قتل کردیا جائے تو اس کا کفارہ بھی یہی ہے، چنانچہ اس آیت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ ۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (2)

اور اگر وہ کسی ایسی قوم سے ہو جو تمہاری دشمن ہے مگر مومن ہے تو اس کے قتل پر بھی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا واجب ہے اور اگر ایسی قوم سے ہو جس میں اور تم میں کوئی معاہدہ ہو تو مقتول کے ورثا کو دیت ادا کرنی ضروری ہوگی اور ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔

(۲) کفارۂ ظہار:

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات مثلاً ماں بہن میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دیکر حرام کردے تو شریعت اسلام کی اصطلاح میں اس کو ''ظہار'' کہتے ہیں اور اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک شوہر کفارہ ظہار ادا نہیں کرے گا اس کی بیوی اس کیلئے حلال نہیں ہوگی۔ کفارۂ ظہار تین چیزیں ہیں، ایک غلام آزاد کرے، ساٹھ دن تک روزے رکھے، یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، ان تینوں میں غلام آزاد کرنے کو مقدم رکھا گیا ہے یعنی جو شخص ایک غلام آزاد کرسکتا ہے اس کے لئے جائز نہیں کہ کفارہ ظہار کسی اور صورت

---

(1) القرآن، ۴:۹۲ (2) ایضاً، ۴:۹۲

میں ادا کرے، قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ(1)

اور جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کرلے اور پھر اپنے قول کو واپس لینا چاہیں تو انکو چاہئے کہ ایک دوسرے کو چھونے سے قبل ایک غلام کو آزاد کریں اس سے تم کو نصیحت ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں کی خبر رکھتا ہے جن پر تم عمل کرتے ہو۔

چونکہ آیت ظہار میں ''رقبۃ'' کا لفظ مطلق آیا ہے مومنہ کی قید سے مقید نہیں ہے اسلئے علمائے احناف کے نزدیک اگر کسی غیر مسلم کو بھی آزاد کردیا گیا تو ظہار کا کفارہ ادا ہو جائیگا اور بیوی اس کیلئے حلال ہوگی۔

(۳) کفارۂ یمین :

اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھالے اور پھر اس کو توڑنا چاہے یا جان بوجھ کر توڑ دی تو اس کو قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا کھلائے یا ان کو کپڑے پہنائے اور یا ایک غلام آزاد کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (2)

تمہاری جو قسمیں لغو ہیں اللہ ان پر تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا مگر ان قسموں پر مواخذ ہوگا تم نے آئندہ کیلئے منعقد کی ہیں اس کا کفارہ دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کھانا کھلانا، یا ان کو کپڑے بنانا، یا ایک غلام آزاد کرنا۔

(۴) کفارۂ افساد صوم :۔

کوئی شخص قصداً وعمداً روزہ فاسد کرے تو اسکا کفارہ بھی کفارۂ ظہار کی طرح ہے کہ ایک غلام آزاد

---

(1) القرآن، ۳:۵۸ (2) ایضاً، ۸۹:۵

کرے۔ اسکی طاقت ہو تو ساٹھ دن تک مسلسل روزے رکھے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ساٹھ مسکینوں کھانا کھلائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رمضان میں قصداً روزہ افطار کیا تو نبی کریم ﷺ نے یہی احکامات فرمائے، (1)

اس کے علاوہ بعض معمولی گناہوں کے ارتکاب پر بھی غلام کو بطور کفارہ آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حدیث میں ہے کہ جس کسی نے اپنے غلام کو طمانچہ مارا یا اس کو زدکوب کیا تو اسکا کفارہ یہ ہے اس کو آزاد کرے۔(2)

سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقت جس طرح نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اس طرح غلاموں کو آزاد کرانے کے بارے میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے، حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا ہے کہ سورج گرہن کے وقت غلام آزاد کیا جائے(3)

غلاموں کے آزاد ہونے کے طریقے

اسلام نے حریت عبد کے جو ترغیبات دیئے ہیں ان کے باوجود بھی اگر ان کے آقا اس کار ثواب پر آمادہ نہ ہوں تو اسلام کے معاشرتی نظام میں غلاموں کے آزاد ہونے کے اور بھی ذرائع موجود ہیں۔

(ا) مکاتبت:

جس طرح شریعت اسلام میں عورتوں کیلئے خلع کا حق رکھا گیا ہے اسی طرح غلاموں کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ غلام رہنا گوارا نہیں کرتے تو انہیں حق ہے کہ اپنے آقا سے مکاتبت کرلیں۔ مکاتبت کی صورت بالکل خلع کی سی ہے، یعنی یہ غلام یا اسکا آقا اس سے کہے کہ غلام اتنی رقم کما کر آقا کو دیدے تو وہ آزاد ہو جائیگا، قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ(4)

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب اذا جامع فی رمضان، ص۹۹۶

(2) امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد، ج۴، ص۳۴۲۔

(3) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب العتق، باب مایستحب من العتاقۃ فی الکسوف ولایات، ص۱۷۲

(4) القرآن، ۲۴:۳۳

اور وہ تمہارے باندی اور غلام جو تم سے مکاتبت کرنا چاہتے ہیں تم اگر ان
میں بھلائی دیکھتے ہو تو ان سے مکاتبت کرلو اور ان کو اللہ کے اس مال میں
سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

عبد مکاتب کی امداد تمام مسلمانوں پر لازم قرار دیا ہے قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جہاں اور مصارف بیان کئے گئے ہیں ان میں بڑی اہمیت کے ساتھ مکاتب کی امداد کرنے کو بھی بتایا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ صدقات صرف فقیروں، مسکینوں، اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں اور ان لوگوں کیلئے جن کی تالیف قلب کی ضرورت ہو اور غلاموں کی گردنوں کو خلاصی دینے کیلئے ہیں۔ (1) پھر بدل مکاتب آدا کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں کہ اپنی زبان سے آزاد کرنے کے کلمات بھی ادا کرے بلکہ متذکرہ رقم کے ادا ہوتے ہی وہ خود بخود آزاد ہو جائیگا۔ اسکے علاوہ فقہاء نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ اگر آقا نے غلام کے بدل کتابت ادا کرنے سے پہلے کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کرلیا جس کے کفارہ میں غلام آزاد کرنا ضروری ہے تو اسکی پاداش میں یہ عبد مکاتب بھی آزاد ہو جائیگا۔ (2)

(۲) مدبر:

اگر ایک شخص اپنی خانگی یا معاشی ضروریات کی بناء پر غلام آزاد نہیں کرسکتا، تو اس کے لئے اسلام نے تدبیر کی راہ پیدا کردی ہے۔ کتابت کی طرح تدبیر سے شرط کے مکمل ہونے پر غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ کہ آقا غلام سے کہے کہ ''تو میری موت کے بعد آزاد ہے'' یا اسی مفہوم کو ادا کرنے کیلئے کوئی اور جملہ بولے۔ وہ غلام جس سے یہ کہا جاتا ہے وہ ''مدبر'' ہوجاتا ہے، بظاہر تدبیر بھی ایک قسم کی وصیت ہے لیکن تدبیر اور وصیت میں فرق یہ ہے کہ وصیت کو واپس لینا اور اس سے رجوع کرلینا جائز ہے لیکن تدبیر کو واپس نہیں لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ غلام کو مدبر کرنے بعد آقا اسکو اپنی زندگی میں نہ تو فروخت کرسکتا ہے اور نہ بطور ہبہ وبخشش دے سکتا۔ مدبر کے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی کہ اگر کسی شخص نے اپنے غلام کے ایک حصہ کو مدبر کردیا ہے تو وہی حصہ نہیں بلکہ پورا غلام مدبر ہو جائیگا، کیونکہ طلاق کی طرح عتق میں بھی تجزی کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔

(۳) ام ولد:

اصطلاح شرع میں ام ولد اس جاریہ کو کہتے ہیں جس کے بطن سے اس کے مولیٰ کیلئے بچہ پیدا ہوا ہو۔ اس کا حکم بھی مدبر طرح یہ ہے کہ آقا کے مرتے ہی آزاد ہوجائیگی، اور جس طرح مدبر کی بیع ناجائز ہے اسی طرح ام ولد کو بیچنا ناجائز ہے، اور نہ اس کو بطور ہبہ کسی کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات اولاد کی بیع سے منع فرمایا اور فرمایا کہ ان کو نہ بیچا

---

(1) القرآن، ۹:۶۰

(2) فقہ کی کتابوں میں ''کتاب العتق'' کے موضوع کے تحت ان پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

جائے، نہ ان کو ہبہ میں دیا جائے اور نہ ان کو وراثت میں منتقل کیا جائے، آقا جب تک زندہ رہے ام ولد سے تمتع کرتا رہے اور جب مرجائے تو وہ آزاد ہے(1) آزاد ہونے کے بعد غلام اور باندی، نکاح، طلاق، لین دین، معاشرت اور سیاست میں کسی حیثیت سے آزاد سے کم نہیں ہوتے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اپنے غلام کو آزاد کردیا اس کی آزادی قطعی ہوگی۔ یہاں تک کہ اس کی شہادت بھی جائز ہے اور اس کی پوری عزت کی جائیگی اور اسکی میراث ثابت ہوگی، اور اس کے آقا کو یہ حق نہیں ہوگا کہ مال یا خدمت ان میں سے کسی چیز کی اس پر کوئی شرط لگائے۔ اس پر غلامی کسی طرح بھی محمول نہیں ہوگی۔ (2) البتہ قبائلی زندگی کی بناء پر آزاد ہونے کے بعد بھی عبد اور مولیٰ کے تعلق کو ایک مخصوص طریقہ سے باقی رکھا گیا ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں ''ولاء'' کہتے ہیں، زید بن حارثہؓ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اس لئے وہ زید بن حارثہ مولی رسول اللہ ﷺ کے نام سے پکارے جاتے تھے، ولاء کا سب سے بڑا فائدہ باندی کو یہ ہوتا کہ اسی بناء پر اس سے نکاح کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ اس ولاء کا نتیجہ یہ بھی ہوتا کہ غلام کی وفات پر اسکا سابق آقا اور سابق آقا کی وفات پر جب کوئی دوسرا وارث نہ ہوتا تو اس کا غلام میراث کا حقدار ہوتا تھا۔ (3)

غلام کے حقوق

اسلام نے اس دور میں، جبکہ غلاموں سے ہر مذہب اور معاشرے میں غیر انسانی اور وحشیانہ سلوک جائز سمجھا جاتا تھا، غلام کو وہ تمام حقوق دئے جن کی بناء اس کا درجہ ایک آزاد انسان کے برابر ہوگیا۔ مثلاً جان کی حفاظت، حدود شریعت میں آزادئ گفتار، نکاح وطلاق کے معاملہ میں آزادی، تحصیل علم وکمال میں آزادی وغیرہ۔

غلام کا قصاص:

ایک انسان کیلئے سب سے زیادہ قیمتی اور عزیز اس کی جان ہے۔ اسلام سے قبل ہر معاشرہ میں ایک غلام کی جان جانوروں سے زیادہ قیمتی نہ تھی۔ اگر وہ قتل کیا جاتا تو کہیں اسکی دادوفریاد نہیں ہوسکتی تھی۔ اسلام نے اس معاملہ میں عبد اور حر دونوں کو بالکل برابر رکھا ہے۔ جس طرح حر کا قاتل مباح الدم اور واجب القصاص ہے اسی طرح عبد کا قاتل بھی خواہ کوئی حر ہو یا غلام، واجب القصاص ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب العتق، باب بیع المدبر، ص ۷۸

(2) امام مالک بن انس بن مالک، موطا امام مالک، باب الشرط فی العتق، اردو ترجمہ علامہ وحید الزمان، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور، ص ۴۴۰

(3) امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد، کتاب افرائض، باب فی میراث ذی الارحام، ص ۴۷۵

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (1)

ہم نے اس پر فرض کردیا کہ نفس کے بدلے نفس دیا جائیگا،

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى(2)

تم پرخون کا خون لینا فرض کردیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔ (3)

قرآن مجید کی یہ آیات اور حدیث مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں، ان سے جس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ حر کا قصاص حر اور عبد دونوں سے لیا جا سکتا ہے اسی طرح یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عبد کے قصاص میں حر اور عبد دونوں کو قتل کیا جاسکتا ہے، اس عمومی مفہوم ہی بناء کے پر تمام فقہاء احناف کا اجماع ہے کہ حر کو عبد کے بدلے میں اور عبد کو حر کے بدلے میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ (4) اس کے علاوہ قرآن مجید میں خود اس کی تصریح کہ جو کوئی کسی پر ظلم کرے گا اس سے بدلہ لیا جائے گا یہ حکم بھی عام ہے، حر اور عبد کی کوئی تخصیص نہیں ہے، ارشاد ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ(5)

جس نے تم پر زیادتی کی ہے، تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی کہ اس نے کی ہے،

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (6)

اور اگر تم عذاب دو تو جتنا تم کو عذاب دیا گیا ہے اتنا ہی تم دو۔

غلام کی شہادت:

شہادت کا معاملہ زیادہ اہم ہے۔ گواہی انہی کی معتبر ہوتی ہے جو صاحب عقل ہوں، جن کا قول دوسروں کے مقابلے میں قابل اعتبار سمجھا جائے۔ کسی شخص کی شہادت کا معتبر ہونا اس کی معاشرتی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔

---

(1) القرآن، ۵:۴۵۔ (2) ایضاً، ۲:۱۷۸۔

(3) القرطبی، ابی عبداللہ محمد بن احمد لانصاری، احکام القرآن، ج ۱، بیروت، ۱۹۸۸ء ص ۱۵۷۔

(4) ایضاً۔

(5) القرآن، ۲:۱۹۴ (6) ایضاً، ۱۶:۱۲۶

دوسرے معاشروں میں غلام کو حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا تھا، اسی بناء پر غلام کی شہادت کا اعتبار نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلام نے باوجود اس کے کہ اسلام میں اصول قبول شہادت بہت سخت ہیں، غلام کی شہادت کو معتبر مانا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے غلاموں اور باندیوں کی شہادت کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا ''غلام کی شہادت جائز ہے، بشرطیکہ وہ عادل ہو'' (1)

غنیمت میں حق مساوات:

جس طرح شہادت کے معاملہ میں غلام اور احرار برابر ہیں اسی طرح مال غنیمت کی تقسیم میں بھی ان کو احرار کے برابر رکھا گیا ہے قرآن مجید میں غنیمت سے متعلق جتنی بھی آیات آئی ہیں ان میں کہیں بھی حر اور عبد کی تفریق نہیں ہے، اسی بناء پر حضرت ابو بکرؓ بیت المال سے جو وظائف تقسیم کرتے تھے ان میں آزاد اور غلام کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ مؤرخ ابن اثیر اپنی تاریخ ''الکامل'' میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سابقین، متاخرین، آزاد اور غلام، مرد اور عورت کے درمیان مال غنیمت برابر تقسیم کرتے تھے۔(2)

حضرت عمرؓ نے اہل عوالی کی مردم شماری کی، اور ان کے وظیفے مقرر کئے، اس کے علاوہ آپؓ کا معمول تھا کہ ہفتہ کے روز عوالی جاتے اور جو ازکار رفتہ غلام مل جاتا اس کا ٹیکس معاف کردیتے۔ ایک روایت میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ ہیں :

حضرت عمرؓ نے فرمایا، میں نے ہر نفس مسلمہ کیلئے ہر مہینہ میں دو من گیہوں اور دو قسط زیتون کے، اور دو قسط سرکہ کے مقرر کئے ہیں، تو اس پر ایک شخص نے کہا ''والعبد''؟ یعنی غلام کو بھی اتنا ملے گا، آپؓ نے فرمایا ''نعم والعبد'' ہاں غلام کو بھی(3)

غلاموں کا نکاح: انسانیت کے حقوق میں ایک حق شادی بیاہ کا ہے۔ اسلام سے پہلے لوگ اپنی آرام اور آسائش کے خاطر غلاموں اور باندیوں کو شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ رومن امپائر تہذیب وتمدن کے اعتبار سے امم قدیمہ میں امتیاز رکھتی ہے لیکن اس کے ہاں بھی غلام کو قانونی طور پر شادی کا حق حاصل نہیں تھا۔ (4)اسلام نے غلام کو یہ حق دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ(5)

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، باب شہادۃ الاماء والعبید، ص۲۴۳

(2) عزالدین ابی الحسن علی بن ابی الکرم ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج۲ دار بیروت لطباعۃ والنشر ۱۹۶۵ء، ص۱۶۲

(3) ابوالحسن احمد بن یحیٰی، البلاذری، فتوح البلدان، منشورات الارومیہ، قسم ایران، ۱۴۰۴ھ، ص۵۶۵

(4) Encyclopedia of Religion and Ethics, vol. 10, Slavery, P. 655

(5) القرآن، النور، ۲۴: ۳۲

تم اپنی غیر شادی شدہ عورتوں اور اپنے نیک غلاموں اور باندیوں کا نکاح کرو۔

عرب میں کچھ لوگ ایسے تھے جو غلاموں کا بیاہ کردیتے تھے مگر پھر جب چاہتے اس میں تفریق کرادیتے تھے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ عہد نبوت میں پیش آیا۔ ایک غلام نے آکر نبی کریم ﷺ سے شکایت کی۔ آپؐ نے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا ''لوگو! کیوں غلاموں کا نکاح کرکے ان میں تفریق کراتے ہو نکاح و طلاق کا حق صرف شوہر کو ہے۔ (1)

حق نصیحت:

اسلام سے پہلے غلام اپنے آقا کے کسی بھی قول وفعل پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اسلام نے فکری اور قولی آزادی کی جس نعمت سے اہل عالم کو نوازا ہے اس سے غلام بھی محروم نہیں ہے۔ اسے حق ہے کہ بغیر کسی خوف وہراس کے اپنے آقا کے فعل پر نکتہ چینی کرے۔ اور ایسا کرنا اس کیلئے جائز ہی نہیں بلکہ باعث اجروثواب ہے، حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهِ وَأَحْسَنَ عِبَادَةَ اللَّهِ فَلَهُ أَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ(2)

غلام اپنے آقا کو نصیحت کرے اور اللہ کی عبادت بھی اچھی طرح سے بجالائے تو اس کو دوہرا اجر ملتا ہے۔

ابورافع جب آزاد ہوگئے تو وہ رو پڑے، لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا ''پہلے میرے لئے دو اجر تھے اب ایک ہی رہ گیا۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے اگر جہاد فی سبیل اللہ اور حج اور ماں کی اطاعت نہ ہوتی تو میں مملوک ہوکر مرنے کو پسند کرتا۔ (3)

اس کے علاوہ طعام اور لباس کے اعتبار سے بھی غلام کو کمتر درجہ پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ جو آقا کھائے وہی اپنے غلام کو کھلائے۔ حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو غلام تمہارے منشاء کے مطابق ہو اس کو جو تم کھاتے ہو وہی کھلاؤ اور جو تم پہنتے ہو وہ اس کو بھی پہناؤ اور جو غلام منشاء کے مطابق نہ ہو اس کو بیچ دو۔ اللہ کے بندوں کو عذاب نہ دو۔ (4) مزید یہ کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے غلام اور

---

(1) امام ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق۔

(2) امام ابو داؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الادب والمفرد، باب اذا نصح العبد لسیدہ، ص۷۱۲، ۷۱۳

(3) ایضاً

(4) سنن ابی داؤد، باب فی حق المملوک، ص۷۱۰

باندیوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بھی تمام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہے۔

صحابہ کرامؓ خاص طور اس کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں غلام کو محض غلام ہونے کی بناء پر سزا نہ مل جائے۔ ایک غلام نے ایک شخص کے باغ سے کھجور کا ایک خوشہ چرالیا، مروان بن الحکم اس وقت مدینہ کا گورنر تھا۔ باغ کے مالک نے اس کے سامنے غلام کی شکایت کی۔ مروان نے اس غلام کو قید کردیا اور چاہا کہ اس پر حد جاری کر کے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالے۔ غلام کا آقا حضرت رافع بن حدیجؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسکے سامنے اپنا معاملہ پیش کردیا، انہوں نے کہا ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ پھل کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا'' اس نے کہا تو ذرا مروان کو بھی یہ حدیث سنادیجئے، حضرت رافع گئے اور مروان کو یہ حدیث سنائی تو انہوں نے غلام کو فوراً رہا کر دیا۔ (1)

غلاموں کو سماجی زندگی میں احرار کے ساتھ پوری برابری حاصل تھی اسلام کے انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ مسلمان غلاموں اور باندیوں کی تعلیم وتربیت میں اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح اہتمام کرتے تھے۔ اور ان کو فضل وہنر اور علم وادب کے حصول میں ان کی پوری طرح اعانت کرتے تھے۔ اور پھر علم وکمال کے زیور سے آراستہ ہوکر جو غلام معاشرے میں آئے، ان کی کما حقہٗ تعظیم وتکریم کی گئی۔ غلامی کا داغ ان کے فضل وکمال میں سد راہ نہ بنا۔ امارت وسیادت کے لئے صرف حسن قابلیت اور اس عہدہ کی لیاقت واہلیت شرط تھی، غلام اور آزاد کا اس میں کوئی فرق نہیں تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے شام کی مہم پر لشکر بھیجنا چاہا، تو اسکی قیادت حضرت اسامہؓ کے سپرد کی حالانکہ اس وقت وہ صرف اٹھارہ برس کے نوجوان غلام تھے۔ اس وقت فوج میں بڑے جلیل القدر صحابہ کرام شریک تھے۔ سب نے اسامہ کی اطاعت کی۔ خلیفۂ اسلام حضرت ابو بکرؓ دور تک لشکر کے ساتھ لے گئے۔ اس شان سے کہ اسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور ابو بکرؓ ان سے لگے ہوئے پیدل چل رہے تھے، حضرت اسامہؓ بولے آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیے ورنہ میں بھی پیدل چلوں گا آپ نے فرمایا کہ نہیں نہ تو میں گھوڑے پر سوار ہونگا اور نہ تم گھوڑے سے اترو گے۔ (2)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں غلاموں سے یہ سلوک کسی اقتصادی طمع اور لالچ کی بناء پر نہیں بلکہ انسانی احترام اور اسلامی اخوت کے طور پر تھا۔ تاکہ ایک مبنی بر انصاف ومحبت معاشرے کا وجود میں آسکے۔

---

(1) ایضاً، کتاب الحدود، باب ما لا یقطع فیہ، ص۳۹۴

(2) اشرف علی تھانوی، مولانا، احکام اسلام، عقل کی نظر میں، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۱۹۷۷ء، ص۱۹۶۔

فصل پنجم

یتیموں کے حقوق

ہر معاشرے اور تہذیب وتمدن کی ترقی میں معاشرے کے افراد کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ مختلف معاشرتی اداروں کے ذریعے افراد کی تربیت کی جاتی ہے۔ اس طرح ہر فرد ایک فعال رکن کے طور پر معاشرہ کو ترقی اور خوشحالی سے ہمکنار کرتا ہے۔ تمام معاشرتی اداروں میں والدین اور خاندان فرد کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر معاشرے کا کوئی فرد کمسنی میں والدین کی سایہ اور شفقت سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی پرورش اور نگہداشت کا موثر اور مناسب انتظام موجود نہ ہو تو وہ معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں کا شکار ہو کر انتشار، بدامنی، اور زوال وانحطاط کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاشرے اور مذہب میں اسوقت کے معاشی اور معاشرتی ضروریات اور مروجہ رسوم ورواج کے مطابق والدین کے سایہ سے محروم افراد یعنی یتیموں کی پرورش اور نگہداشت کا طریقہ کار وضع کیا جاتا تھا۔

عربوں میں روزمرہ کی قتل وغارت اور بدامنی کے سبب یتیموں کی کثرت تھی لیکن ان کفالت اور پرورش کا کوئی موثر انتظام نہیں تھا۔ عام قبائلی دستور کے مطابق اور مضبوط خاندانی نظام کی بناء پر یتیموں کی پرورش برادری اور خاندان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ یہ نظام ابتداء میں تو موثر تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی معاشی لالچ اور حرص وطمع نے اس نظام میں خامیاں پیدا کیں۔ یتیموں کے ساتھ شفقت اور صلہ رحمی کی بجائے سنگدلی اور سختی کا سلوک روا ہونے لگا۔ قرآن مجید میں عربوں کے اس سنگدلانہ رویئے کی مذمت کی گئی ہے، فرماتے ہیں:

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (1)

کیا تو نے اس کو دیکھا ہے جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہونے کے خوف سے ان کے والدین کی متروکہ جائیداد اور وراثت کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتے ہیں:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (2)

---

(1) القرآن، ۱۰۸: ۱، ۲ (2) ایضاً، ۸۹: ۱۷ تا ۲۰

نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے ہو او نہ ایک دوسرے
کومسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہواور مردے کا پورامال سمیٹ کر کھاتے
ہو اور دنیا کے مال ودلت پر جی بھر کر رکھتے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم وشفقت اور پرورش امداد کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ توراۃ میں عشر وزکوۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کیساتھ یتیم کا نام بھی ایک دوجگہ ملتا ہے کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور سیر ہوں۔ (1) انجیل نے یتیموں کی دادرسی اور تعلیم تربیت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہندو مذہب اور معاشرہ میں بھی یتیموں کی کفالت اور پرورش کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ یتیموں کی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لایا۔ وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلایا۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰیo .....فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (2)

کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا تو اس نے پناہ دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سو جو یتیم ہو
اس کو مت دباؤ

مکہ میں نبی کریم ﷺ یتیموں کے بارے میں اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے، قریش مکہ کے رئیسوں اور سرداروں کو یتیموں پر رحم کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ مکی آیات میں دولتمندوں کو غریبوں اور یتیموں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلے میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے۔ اس گھاٹی کو غلاموں کی آزاد کرکے، بھوکوں کو کھانا کھلاکر اور یتیموں کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کر کے پار کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍo یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍo اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ(3)

یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھانا کھلانا

نیک لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کیساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں:

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا (4)

---

(1) استثنا، ۱۲، ۱۴، ۲۶، ۲۹

(2) القرآن، ۹۳:۶ اور ۹ (3) ایضاً، ۹۰:۱۴ تا ۱۶ (4) ایضاً، ۷۶:۸

اور اس کی محبت کے ساتھ کسی غریب اور یتیم کو کھانا کھلاتے ہیں

ہجرت مدینہ کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانونی صورت اختیار کر لی۔ یتیموں کے بارے میں خاص قوانین آئے۔ انکو وراثت کا حق دلایا گیا۔ متولیوں کو یتیموں کے مال میں بد دیانتی سے منع کیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (1)

اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دیدو، اور ان کے اچھے مال کو برے مال سے بدلا نہ کرو۔ اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملاؤ تاکہ اس کو کھاسکو۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں دستور تھا کہ مالدار یتیم لڑکیوں کو ان کے مال ودولت سے محروم کرنے اور ان کی دولت پر قبضہ جمانے کی خاطر ان سے نکاح کرتے تھے، لیکن ان کو بیوی کا درجہ دینے کیلئے تیار نہ ہوتے۔ اسلام نے اس معاشرتی رویے کی مذمت کی اور بتایا کہ یتیم لڑکیوں کے شادی کی صورت میں ان سے مساوی برابری کا سلوک روا رکھا جائے ورنہ ان کو چھوڑ کر دوسری پسند کی عورت سے نکاح کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ (2)

اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے تو (ان کو چھوڑ کے اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کرلو۔

مال دولت اور اقتصادیات چونکہ معاشرے کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے اسلامی معاشرہ می یتیم کی مال ودولت کی حفاظت اور نگہداشت کا موثر انتظام کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یتیم جب تک سن شعور کو نہ پہنچے، ان کی مال ودولت اور جائداد کی حفاظت، نگہداشت اور اس میں نمو وترقی کی کوشش کرنا متولی کی ذمہ داری ہے۔ یہ مال ودولت متولی کے پاس آمانت ہوگی اس کی حفاظت کرنا اس پر فرض ہے اور سن شعور کو پہنچنے پر بلا کم وکاست مال ودولت یتیم کے حوالے کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، اس سلسلے میں کسی قسم کی حیلہ بازی اور دھوکہ دہی سے کام لینے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

---

(1) القرآن ۴:۲ (2) ایضاً، ۴:۳

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (1)

اور بے وقوفوں کو ان کا مال، جس کو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے قیام کا ذریعہ بنایا، مت دیدو۔ اور ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو۔ اور ان سے معقول بات کرتے رہو۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کردو۔

یتیموں کے مال میں بیجا تصرف سے منع کیا گیا ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا (2)

اور اڑا کر جلدی ان کا مال نہ کھاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔

صاحب جائداد یتیموں کے متولی اگر دولتمند ہو تو ان کیلئے یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ لینا بھی خلاف اخلاق قرار دیا گیا۔ البتہ جو متولی تنگدست ہو ان کو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَمَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (3)

اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو چاہئے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو وہ منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی کہ یتیموں کیساتھ معاشی اور معاشرتی انصاف کیا جائے کوئی فرد صرف اسلئے کہ وہ والدین کے سایہ سے محروم ہے بے انصافی اور زیادتی کا شکار نہ ہو جائے۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ (4)

اور یہ کہ یتیموں کیلئے انصاف پر قائم رہو۔

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت اور حرمت میں بے معنی

---

(1) القرآن، ۴: ۵ تا ۶ (2) ایضاً، ۴: ۶

(3) ایضاً، ۴: ۶ (4) ایضاً، ۴: ۱۲۷

جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی اور روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں ایک یہ ہے کہ بہتری کی غرض کے سوا یتیموں کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچ جائے (1)

سورۂ اسرائیل کے آٹھ خلاقی اور قانونی اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال سے صاحب جائداد یتیموں کے مال ودولت کے پاس کسی اور غرض سے نہیں پھٹکنا چاہئے اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے، (2) صاحب جائداد یتیموں کی مال ودولت کی حفاظت اور نگرانی کے متعلق تعلیمات کے علاوہ جو یتیم غریب اور مفلس ہوں ان کے بارے اسلامی معاشرہ کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت کا خیال رکھے۔ چنانچہ قرآن مجید نے سورۂ بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں ان کی پرورش اور ان کیساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی ہے۔ خیرات وصدقات کیلئے بہترین مصارف یتیم اور مساکین قرار دیئے ہیں۔

ان تعلیمات وحی کی وضاحت نبی کریم ﷺ نے مختلف موقعوں پر کی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کے ان نیک افراد کو جو بے والی اور لا وارث یتیموں کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا کہ میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہونگے۔ (3) نیز یہ بھی فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہو اور سب سے بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کیساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔ (4)

انہی قرآنی آیات اور آحادیث مبارکہ کی روشنی میں جو اسلامی معاشرہ قائم ہوا اس میں یتیموں کی حقوق کی ہر طرح حفاظت کی گئی۔ معاشرے کے ہر فرد کا گھر یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کی پرورش اور کفالت کیلئے کئی افراد بیک وقت پیشکش کرنے لگے۔ حضرت عائشہ اپنے خاندان اور انصار وغیرہ کی یتیموں کی پرورش کرتی تھیں صحابی رسول عبداللہ بن جدعانؓ کا معمول تھا کہ کسی یتیم کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ (5) صحابہ کرام نہ صرف یہ یتیموں کے مال ودولت میں دیانتداری کا مظاہرہ کرنے لگے بلکہ ان کی جائداد کی حفاظت میں اس سے بھی بڑھ کر فیاضی کا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص کے نخلستان کے

---

(1) القرآن، ۶:۱۵۲ (2) ایضاً، ۱۷:۳۴

(3) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب الادب والمفرد، باب من یعول یتیماً، ص۲۵۸

(4) ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، ابن ماجہ، کتاب الادب والمفرد باب من یعول یتیماً، اردو ترجمہ، علامہ وحید الزمان، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۲۶۳

(5) ایضاً، باب من یعول یتیماً، ص۲۵۸

بارے میں دعوی کیا مگر وہ دعوی ثابت نہ ہو سکا اور آپؐ نے وہ نخلستان اس شخص کو دیدیا، وہ اس پر رو پڑا آپ کو اس پر رحم آیا اور اس شخص سے فرمایا کہ یہ نخلستان اس یتیم کو دیدیں اللہ تعالیٰ تم کو اس کے بدلے جنت دیں گے مگر اس پر بھی وہ شخص راضی نہ ہوا تو ایک اور صحابی رسول نے اسکو خرید کر اس یتیم کو دیدیا۔ وسیع اسلامی سلطنت میں جگہ جگہ یتیم خانے کھول دیئے گئے اور قانوناً قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ بے والی یتیموں کے سرپرست ہوں۔ ان کی جائدادوں کی نگرانی اور ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی کا انتظام کریں۔ (1)

---

(1) ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب السلطان الولی، ص ۴۹۷

فصل ششم

اسلامی معاشرہ میں معذوروں کے حقوق

مضبوط اور مستحکم معاشرے کا قیام افراد کے ان معاشرتی رویوں پر منحصر ہے جو افراد اجتماعی صورت میں روا رکھتے ہیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب معاشرے کا ہر فرد اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی صلاحیت اور قوت اجتماعی مفاد کیلئے استعمال کرے۔ دوسری طرف معاشرتی اور سماجی نظام میں بھی یہ خوبی ہو کہ ہر فرد کے جسمانی اور ذہنی صلاحت سے فائدہ اٹھائے۔ انسان فطری طور پر جسمانی اور ذہنی تفاوت رکھتے ہیں۔ انسان کی یہ تفاوت اور اختلاف جو کہ اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے، جب غیر معمولی صورت اختیار کرلے، انسانی جسم یا ذہن روزمرہ افعال اور کام کے سرانجام دینے سے قاصر رہے تو اس کو معذور کہا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں معذوروں اور بیماروں کے حقوق مقرر کئے گئے ہیں۔ جن میں سرفہرست یہ ہے کہ ان کو عبادات اور فرائض کی بجا آوری میں سہولت دی گئی ہے۔ بہت سے فرائض جن کے آدا کرنے سے وہ معذور ہوں، یا جن کے آدا کرنے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے ان کو معاف یا کم کردیا ہے۔ قرآن میں اس کے لئے ایک کلی اصول بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (1)

عذر کبھی تو شخصی طور پر لازم ذات ہوتا ہے جو فطرتاً انسان سے جدا نہیں ہوتا، مثلاً بڑھاپا یا دائمی اور پیدائشی معذوری وغیرہ اور کبھی عارضی۔ پھر عارضی عذر بھی یا تو بدنی ہوتا ہے جیسے بیماری، یا پھر مالی ہوتا ہے جیسے افلاس یا فقدان سفر وغیرہ۔ بہر حال عذر جیسا بھی ہو، وہ تمام عبادات جس میں جسمانی مشقت یا مالی وسائل کی ضرورت ہو، معاف کردئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرتے ہیں:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَاعَلَى الَّذِيْنَ لَايَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ(2)

ضعیفوں پر، مریضوں پر اور ان لوگوں پر جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں، کوئی گناہ نہیں جبکہ ان کے دل اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ صاف ہوں۔

---

(1) القرآن، ۱۷:۴۸ (2) ایضاً، ۹۱:۹

عذر کی بناء پر وضو کی بجائے تیمم کی اجازت دی گئی ہے۔ (1)ابتدائے اسلام میں تمام مسلمانوں پر تہجد کی نمازفرض کی گئی تھی بعد میں بیماروں اور دوسرے معذور افراد کی وجہ سے رخصت دی گئی۔ (2)اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیماروں کیلئے رعایت کی گئی۔ (3) نماز جیسے اہم فریضہ کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ کوئی عذر کی وجہ سے کھڑے ہوکرنہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہوتو لیٹ کر پڑھنے کی رخصت دی گئی ہے۔ اسلام نے ان عبادات میں معذورکوسہولت دی ہے لیکن اس کے باوجود ان کوا نہی اعمال پر دوسرے صحیح وسالم افراد کے برابر اجر وثواب کی خوشخبری دی گئی ہے۔

عبادات اور فرائض میں سہولت کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ میں معذور وں کے نفسیاتی طور پر دلجوئی کی جاتی ہے۔ اسلام کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے انسان کو زندگی کی نعمت سے نوازا ہے اور پھر انسان کوعقل اور حواس خمسہ دیکر زندگی کی اس نعمت کی حفاظت کاانتظام کیا ہے۔ انسان کو اگر اللہ تعالیٰ ایک جسمانی نقص کسی میں پیداکرتا ہے یا پھر کسی حادثہ میں اس کاکوئی عضو ضائع ہو جاتا ہے تو اس کا ازالہ دوسرے حواس میں زیادتی اور تیزی سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً گونگے بہرے افراد کیلئے بینائی زبان اور آواز کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ اسی طرح نابینا افراد کیلئے قوت سامعہ اورقوت لامسہ بینائی کا قائم مقام بن جاتی ہے۔

تاریخ کے مختلف ادواراور انسانی معاشروں مروجہ عقائد کی روشنی میں معذورافراد کومعاشرتی اور سماجی رتبہ دیا گیا ہے۔ ہندو معاشرہ اورعقیدہ تناسخ رکھنے والی دوسرے قوموں کے نزدیک چونکہ جسمانی اور عقلی نقائص اور معذوری بھی دوسرے سانحوں کی طرح گذشتہ زندگی کے کسی جرم کی سزاکے طور پر واقع ہوتے ہیں اس لئے معذور افراد کسی قسم کی رحم یا ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔ معذور افراد کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے مخیّر اور دولتمند لوگ ان کو خیرات وغیرہ دیکر نجات حاصل کریں۔

اسلامی معاشرہ میں جہاں رنگ، نسل، اور قومیت ولسانیت کی بناء پر افراد کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیاجاتا وہاں صحیح سالم افراد اور معذوروں کے درمیان بھی کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ کوئی بھی فردصرف اس کی معذوری کی بناء پر کسی کمتر سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اسلام ایسے افراد کوبھی صحیح سالم افراد کی طرح فرائض کی آدائیگی کے نتیجے میں وہی حقوق دیدیتاہے۔ اسلامی معاشرہ ایسے افرادمیں زندگی کی امنگ پیداکرکے انہیں اپنے ماحول میں دلچسپی لینے کی ترغیب ہے اسی طرح معذور افراد بھی معاشرے کے مفید شہری بن جاتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ اور ابتدائی اسلامی معاشرہ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

---

(1) القرآن، ۶:۵

(2) ایضاً، ۲۰:۷۳

(3) ایضاً، ۲:۱۹۶

مکی دور کے اولین حصے میں نبی کریم ﷺ ایک دن سرداران قریش کو اسلام کے بارے میں سمجھا رہے تھے کہ اسی وقت ایک نابینا صحابی عبداللہ بن مکتومؓ آئے اور محل گفتگو ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے ترش روئی اختیار کی جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ سرداران قریش کی بجائے اس نابینا کی داد رسی اور اس کی تشفی کی زیادہ ضرورت تھی، (1) جس کے بعد جب بھی عبداللہ بن مکتومؓ نبی کریم ﷺ سے ملتے تو آپؐ نہایت تکریم سے پیش آتے تھے۔

اسلامی معاشرہ میں معذور افراد کو کوئی الگ کروہ نہیں سمجھا جاتا۔ صحیح سالم افراد کے ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کی تلقین کی گئی ہے۔ معذور افراد جس گھر اور خاندان کے آراکین ہوں۔ انھیں اسی ماحول میں جذب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بصورت دیگر کسی دوسرے ماحول میں جانے کی وجہ سے ان کا اپنا گھریلو ماحول اس کیلئے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے صلہ رحمی کا تقاضا ہے کہ معذور افراد کے قریبی رشتہ داران کی زندگی کو کامیاب بنانے میں ان کی معاونت کریں۔ اور معاشرہ کی ابتدائی اکائی یعنی خاندان مل کر ایک فرد کی حالت کو سنوارے۔ اسی طرح ایک معذور فرد کی آباد کاری ایک خاندان کا اپنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ ۔ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْبُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ۔ (2)

”نا بینا پر اور لنگڑے پر اور مریض پر اور خود تم پر کوئی تنگی نہیں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے والد کے یا ماؤں، بھائیوں، بہنوں، چچاؤں، خالاؤں یا جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے“

چونکہ معذور افراد با مشقت عبادات اور جہاد وغیرہ میں شرکت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے نبی کریم ﷺ ایسے موقعوں پر ان کو مدینہ میں صحابہ کرام کی گھروں کی حفاظت اور گھریلوں امور کی نگرانی کیلئے چھوڑتے تھے۔ اس طرح ان کی مناسبت سے معاشرتی ذمہ داری ان کے حوالے کرتے تھے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ معاشرہ

---

(1) القرآن، ۸۰:۱تا۱۰

(2) ایضاً، ۲۴:۶۱

میں معذور افراد سے ان کی استطاعت اور صلاحیت کے مطابق کام لیا جانا چاہئے۔ اس سے ایک تو معذور افراد تنہائی اور احساس کمتری کے شکار نہیں ہوں گے دوسری بات یہ کہ معاشرہ ان کے صلاحیتوں سے مستفید ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ اسلام میں معذوروں کے مندرجہ ذیل حقوق مقرر کئے ہیں:

(۱) معذوری مثلاً نابینائی، گونگا پن، بہرہ پن اور لنگڑا پن ازدواجی زندگی کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ معذور افراد کو بھرپور ازدواجی کا حق حاصل ہے۔

(۲) تعلیم وتربیت سے مزین ہونے کے بعد معلم اور امام کی حیثیت سے روزگار کا حق حاصل ہے۔

(۳) شہادت جس طرح ایک دوسرے شہری کی معتبر ہوتی ہے اسی طرح افراد بھی کو بھی شہادت کا حق حاصل ہے۔

(۴) اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی اگر ضروریات زندگی کی فراہمی سے محروم رہے یا پیرانہ سالہ کی وجہ سے محروم المعیشت ہو تو پورے معاشرے اور ریاست کی یہ ذمہ اری ہو گی کہ ایسے افراد کی نان ونفقہ کا انتظام کریں۔

(۵) اپنے آباواجداد اور دوسرے ذی محرم سے ورثہ پانے کا مستحق ہے۔ محض جسمانی یا عقلی معذوری کی وجہ سے کسی کو وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(۶) معذور افراد کا با مشقت عبادات سے مستثنیٰ ہونا ان کی توہین نہیں بلکہ ان کے ساتھ رعایت ہے۔ وہ اس کے بغیر بھی اسی اجر وثواب کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

فصل ہفتم

معاشرتی ذمہ داریاں اور حصائل

اسلام اجتماعی زندگی میں فرد اور معاشرہ کی یکساں اہمیت کا قائل ہے۔ ایک طرف قرآن مجید میں تمام معاشروں کیلئے مشترک سرنوشت، مشترک نامہ عمل، فہم وشعور، عمل اور اطاعت اور عصیان کا ذکر ہے تو دوسری طرف فرد کی اصلاح اور اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان پیدائش کے ساتھ کچھ چیزوں کیلئے بالقوہ اور استعدادی صلاحیت کے تحت میلانات اور تحریکات لیکر پیدا ہوتا ہے اور ایک باطنی قوت خارجی عوامل کی مدد سے ان چیزوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اب اگر یہ باطنی قوت اس کی بالقوہ اور استعدادی صلاحیت سے ہم آہنگ ہوکر متشکل ہوجائے تو وہ ایسی انفرادی اور اجتماعی افعال سرانجام دیدیتا ہے جو اس کے لائق ہے اور انسانیت کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر خارجی عوامل کے جبر سے اس پر مذکورہ فعلیت کے علاوہ اور فعلیت مسلط کی جائے تو وہ ایک مسخ شدہ ہستی میں تبدیل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں انسان کی اعلیٰ ترین تعریف بھی کی گئی ہے اور سخت ترین مذمت بھی۔ جہاں انسان کو زمین وآسمان اور فرشتوں سے برتر پیش کیا گیا ہے وہاں اسے جانوروں سے بھی پست ترین دکھایا گیا ہے۔ قرآن کے مطابق جہاں انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ قوائے عالم کو مسخر کرسکتا ہے اور فرشتوں سے بھی کام لے سکتا ہے وہاں اپنے اعمال کی پاداش میں اسفل سافلین میں بھی گرسکتا ہے۔

انسان اگر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ملکوتی صفات سے متصف ہوں تو اس کا درجہ فرشتو ں سے بھی بڑھکر ہے لیکن صرف بہیمی قوتوں اور لذائذ کا اسیر ہو جائے تو وہ پست درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ صفات انفرادی اہمیت کی حامل ہونے کے باوجود اجتماعی زندگی کیلئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں صدق، عفت و پاکبازی، پابندی عہد، احسان،، عفوودرگزر، مساوات۔ اخوت، ایثار اور اعتدال ومیانہ روی وغیرہ شامل ہیں۔

ان معاشرتی صفات اور اخلاقی فضائل کو ہر معاشرے میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب کی بنیاد انہی اخلاق حسنہ پر رکھی گئی ہے، جتنے پیغمبر اور مصلح آئے ہیں سب نے یہی تعلیم دی۔ صدق، انصاف، ایثار اور بھلائی کا حکم دیا جبکہ کذب، ظلم اور برائی سے منع کیا گیا ہے تاہم نبی کریم ﷺ کی بعثت اس سلسلے میں بھی تکمیلی حیثیت رکھتی ہے۔ خود آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں حسن اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں (1) ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب اور بروز حشر سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو

---

(1) امام ترمذی، جامع ترمذی کتاب البر والصلہ، ص ۲۹۸

اخلاق میں سب سے زیادہ بہتر ہوں اور میری نگاہ میں سب سے زیادہ مبغوض اور بروز قیامت سب سے دور وہ لوگ ہونگے جو زیادہ بکواس کرتے ہوں، خواہ مخواہ کلام کو طول دیتے ہوں اور تکبر کرتے ہوں۔ (1) حضرت معاذؓ کو سفر پر رخصت کرتے وقت بھی نبی کریم ﷺ نے جو آخری وصیت فرمائی وہ یہ تھی کہ لوگوں کے ساتھ اپنے اخلاق اچھے رکھو(2) اسی لئے انہی تعلیمات کی نتیجے میں جو اسلامی معاشرہ قائم ہوا اس میں اخلاق کو ایمان کا لازمی حصہ قرار دیا گیا اور اخلاقی صفات سے عاری ایمان کو ناقص قرار دیا گیا۔

آئندہ صفحات میں ان معاشرتی ذمہ داریوں، انفرادی واجتماعی اخلاقی فضائل اور اسلام کے معاشرتی زندگی میں ان کی اہمیت پر بحث کی جائے گی جو اسلامی معاشرے کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

صدق

اجتماعی زندگی انسانوں کے باہمی تعلقات، ارتباط اور میثاق و معاہدات کا نام ہے۔ بشری تعلقات اور معاہدات میں استحکام اور پائداری تب ہی ممکن ہے جب معاشرتی زندگی اعتماد اور ایک دوسرے پر یقین کی فضا قائم ہو، جس کیلئے اولین شرط یہ ہے کہ افراد کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ اسی قول وفعل کی مطابقت اور ہم آہنگی کو صدق اور سچائی کا نام دیا جاتا ہے۔ صدق اور سچائی انسان کو بہت سے برائیوں سے بچاتی ہے۔ جو سچا ہوگا وہ ہر قسم کی معاشرتی برائی سے پاک ہونے کی کوشش کرے گا۔ وہ راست باز، راست گو اور وعدے کا پابند ہوگا۔ ریا، نفاق اور خوشامد سے مبرا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا۔ لوگوں کو اس کے قول وفعل پر اعتبار ہوگا۔ مختصر یہ کہ معاشرے کا ایسا فرد اجتماعی زندگی کی ترقی اور نشوونما میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں صدق اور سچائی کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اور صدق کو اللہ تعالیٰ کی صفت بتایا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (3)

اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔

اللہ تعالیٰ سچے ہیں اس لئے اس کی شریعت بھی سچی ہے، فرمایا:

---

(1) امام ترمذی، جامع ترمذی کتاب البر والصلہ، ص ۶۹۸

(2) امام مالک بن انس بن مالک، موطا امام مالک، اردو ترجمہ علامہ وحیدالزمان، اسلامی اکادمی اردو بازار، لاہور، ۱۴۰۲ھ، ص ۶۲۹، ۶۳۰

(3) القرآن، النساء، ۴:۸۷

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (1)

کہہ دیجئے کہ اللہ سچے ہیں پس ابراہیم حنیف کی دین کی پیروی کرو۔

صدق اور سچائی تمام انبیائے کرام کا وصف رہا ہے، اس لئے کہ نبی اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن انبیائے کرام کا ذکر قرآن میں کیا ہے سب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کی پہلی صفت صدق اور سچائی رہی ہے۔ فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا(2)

اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور نبی حضرت ادریسؑ کو اللہ تعالیٰ نے اسی صفت سے موصوف کیا ہے :

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (3)

حضرت مریم، جنھوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا پس وپیش نہیں کیا، اس صفت سے ممتاز ہوئیں۔ فرمایا گیا:

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ(4)

اور ان کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یوسف جو خواب کی تعبیر میں سچے نکلے، بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے :

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (5)

یوسف !اے بڑے سچے۔

اسی طرح اللہ اور ان کے انبیاء پر ایمان رکھنے والے اہل ایمان کی بھی یہی صفت بتائی گئی ہے کہ انکے قول فعل میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہوتا، اور ہر حقیقت وسچائی دل وجان سے تسلیم کرنے والے ہوتے ہیں۔ جن لوگو ں کے ساتھ اللہ کی خوشنودی اور جنت ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے ان میں وہ افراد شامل ہیں جن میں دوسری صفات کے ساتھ سچائی اور راست بازی کی صفت بھی ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے لئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہیں ان میں اسلام اور ایمان اور اطاعت الٰہی کے بعد سب سے پہلا درجہ راست بازوں کا ہے۔ فرمایا:

---

(1) القرآن، ۳:۹۵

(2) ایضاً، ۱۹:۴۱ (3) ایضاً، ۱۹:۵۶

(4) ایضاً، ۵:۷۵ (5) ایضاً، ۱۲:۴۶

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا(1)

بیشک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں اور فرمانبردار مرد اور عورتیں، اور سچے مرد اور عورتیں، اللہ نے ان کیلئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کو نہ صرف یہ کہ صدق اور سچائی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے بلکہ سچائی کا ساتھ دینے، صدیقین کے ساتھ رابطہ رکھنے اور ان کی صحبت میں رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ(2)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

نبی کریم ﷺ نے مختلف پیرایوں میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہوسکتا ہے۔ پھر پوچھا کہ بخیل ہوسکتا ہے؟ جواب دیا ہوسکتا ہے۔ پھر دریافت کیا جھوٹا بھی ہوسکتا ہے؟ فرمایا نہیں (3) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے، اور جس میں ان میں ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے۔ جب امنت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی اقرار کرے تو پورا نہ کرے اور جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے۔ (4)

نبی کریم ﷺ کی ان احادیث مبارکہ سے یہ معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لیجاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا ہے، اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے، اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتی ہے اور بدکاری دوزخ کو لیجاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے (5)

---

(1) القرآن، ۳۳:۳۵ (2) ایضاً، ۹:۱۱۹

(3) امام مالک، موطاامام مالک، باب ما جاء فی الصدق والکذب، ص۶۹۲

(4) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب الایمان، ص۱۱۳۔

(5) ایضاً، کتاب الادب، ص۲۹۶

مختصر یہ کہ صدق اور سچائی اسلامی تعلیمات کا بنیادی حصہ ہے۔ کوئی بھی انسان صدق اور سچائی کے بغیر کامل مومن اور اسلامی معاشرے کا حقیقی رکن نہیں بن سکتا۔ یہ بھی واضح ہے کہ صدیقیت دل، زبان اور عمل کی سچائی اس پر قائم رہنے کا نام ہے۔

دیانتداری اور امانت

معاشرتی تعلقات اور آپس کے لین دین کے معاملات میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے جو کہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ فرد کا اپنے کاروبار، روزمرہ کے معاملات اور معاشرتی فرائض وحقوق کو مقررکردہ حدود وقیود کے مطابق احسن طریقے سے بجالانا دیانتداری ہے جسے عربی میں امانت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے بنی نوع انسان کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا(1)

بیشک ہم نے امانت آسمانوں پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بیشک وہ ظالم اور نادان ہے۔

اللہ کا جو فرشتہ اس کا پیغام لیکر خاص بندوں پر اترتا تھا امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ انسانوں جو حکم اللہ کی طرف سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر حقیقت پر مبنی ہے اور پوری طرح قابل عمل ہو، اسی لئے قرآن مجید میں اس فرشتہ کا نام الامین رکھا گیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ(2)

یعنی اس پیغام کو لیکر امانت والی روح اتری

مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ(3)

اس کا کہا مانا جاتا ہے وہ امانت والا ہے

---

(1) القرآن، ۳۳:۷۲ (2) ایضاً، ۲۶:۱۹۳ (3) ایضاً، ۸۱:۲۱

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ(1)

میں تمہارے لئے امانتدار قاصد ہوں

اللہ تعالیٰ کی شریعت اور مانت پر یقین رکھنے اور اس پر سچائی کیساتھ عمل کرنے والوں کی صفت بھی یہ بتائی گئی ہے:

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ(2)

جو اپنی امانتوں کا پاس رکھتے ہیں

اسلامی معاشرے اور اس کے ہر فرد کو حکم ہے کہ امانت ان کے اہل افراد کے حوالے کردیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهْلِهَا(3)

بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کردیا کرو۔

نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ قرآن کی عملی تفسیر اور تمام مسلمانوں کیلئے اسوۂ حسنہ تھی۔ یہی وجہ ہے آپؐ نے قول وفعل سے دیانتداری اور امانتداری کی تاکید فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ امانت کا دائرہ صرف جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ کسی کی پوشیدہ راز کی حفاظت اور صحیح رائے اور مشورہ دینا بھی امانت ہے اور امانت میں خیانت کرنا منافق کی نشانی بتائی گئی ہے (4) یہ بھی فرمایا کہ میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت ہر قائم رہی گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے۔ (5)

ایثار اور قربانی

ایثار معاشرہ کی قیام اور استحکام میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ایثار دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم

---

(1) القرآن، ۲۶:۱۰۷، ۱۲۵، ۱۴۳، ۱۶۲، ۱۷۸ (2) ایضاً، ۲۳:۸

(3) ایضاً، ۴:۵۸

(4) سنن ابی داؤد، ج ۳ کتاب الادب، باب فی المشورۃ، ص ۷۰۰۔ وصحیح البخاری کتاب الایمان، باب علامۃ المنافق، ص ۱۱۳

(5) علامہ علاوالدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی البرہان، کنزالاعمال فی السنن القوال والافعال، ج ۳ موسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۵

رکھنے، دوسروں کو کھلانے، خود تکلیف اٹھانے اور دوسروں کو آرام پہنچانے کا نام ہے۔ اسلام سے پہلے بھی عربوں میں ایثار اور قربانی کا جذبہ موجود تھا لیکن ان کا یہ جذبہ، ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی اور تکلیف کے وقت ایثار کا مظاہرہ صرف قرابتداروں اور اپنے خاندان وقبیلوں والوں تک محدود تھا۔ اسلامی تعلیمات کی بدولت مدینہ میں سب سے پہلے مذہب اور ایمان کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ تشکیل کی گئی۔ معاشرتی تعلقات اور ایثار وقربانی میں ایمان اور اہل ایمان کو مقدم رکھا گیا۔

ہجرت مدینہ کے بعد اسلامی معاشرہ میں یہ وصف نمایاں رہا۔ مہاجرین مکہ جب بے سروسامانی کی صورت میں مدینہ پہنچے تو انصار مدینہ نے ان کی مدد کی۔ اپنا سب کچھ انکے حوالے کیا۔ خود تکلیف برداشت کی لیکن ان کی آرام آسائش کا ہر طرح خیال رکھا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ کی اس صفت کو یوں بیان فرمایا ہے ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (1)

اور ان کے واسطے جنھوں نے ان سے پہلے اس مقام میں اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں ان سے جو اپنا گھر بار چھوڑکران کے پاس چلا آیا اور ان کو دیئے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی کیوں نہ ہو اپنے سے مقدم رکھتے ہیں۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسی ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

اسلام اجتماعی زندگی میں اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ جس سے معاشرتی زندگی میں اجتماعیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایثار وقربانی اعلیٰ مقاصد کیلئے دی جاتی ہے جس میں اللہ کی رضا جوئی، رسول اکرم کی اسوۂ حسنہ کی پیروی اور دین اسلام کی سربلندی کی جدوجہد شامل ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرے کے ہر فرد مومن کی زندگی اور اس کی مال ودولت اللہ تعالیٰ جنت کے بدلے خرید چکے ہیں(2) ایک اور آیت میں مومن کی صفت بتائی گئی ہے کہ اس کی نماز، اس کی قربانی، اس کی زندگی اور موت اللہ کیلئے ہوتی ہے۔ (3) انسان کو

---

(1) القرآن، ۹:۵۹ (2) ایضاً، ۹:۱۱۱

(1) ایضاً، ۶:۱۶۲

اپنی اولاد، عزیز وآقارب اور مال ودولت سب سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اس کی یہ محبت اجتماعی زندگی میں اعلیٰ مقاصد کی خاطر ایثار وقربانی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔قرآن میں بتایا گیا ہے کسی بھی قوم کو اس کی مال ودولت اور اولاد اجتماعی مفاد سے زیادہ عزیز ہو جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرے(1) صحابہ کرام نے قرآنی آیات کی روح کو سمجھتے ہوئے امن اور جنگ، دکھ اور سکھ میں ایثار وقربانی کا عملی نمونہ پیش کیا۔خود بچوں سمیت بھوکے رہ کر دوسروں کو کھانا کھلایا(2)، خود پیاس کی حالت میں موت کو گلے لگایا لیکن دوسروں کو پانی پلایا۔ (3)صحابہ کرامؓ کی انہی ایثار وقربانی کے نتیجے میں ایک مثالی معاشرہ قائم ہوا۔

اعتدال اور میانہ روی

توازن، اعتدال اور میانہ روی پر تمام کائنات کا نظام قائم ہے۔ انسان بھی اسی کائنات کا ایک حصہ ہے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی فطری اور طبیعی قوتوں سے ہم آہنگ ہو کر اعلیٰ مقاصد کی حامل ہوسکتی ہے۔ انسان کا انفرادی اور اجتماعی رویّوں میں اعتدال اور میانہ روی کا مظاہرہ کرے۔ امت مسلمہ امّۃ وَسطاً اور اسلامی معاشرہ ایک معتدل معاشرہ ہوتا ہے۔ ہر فرداعتدال پسند اور تمام معاشرہ کا قیام اعتدال اور میانہ روی پر ہوتا ہے۔ اسلامی عقائد اور عبادات کی طرح اسلامی معاشرہ اور اس کا ہر فرد افراط وتفریط سے پاک ہوتا ہے۔ اسلام ہر معاملہ میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔عبادات میں بھی یہی تعلیم ہے نماز کے بارے ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا(4)

اور نہ پکارو اپنی دعا میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے درمیان کی راہ۔

انسان کی چال ڈھال اس کی گفتگو انسانی شخصیت اور وقار کی علامت ہے۔ اس کے بارے اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ انسان کی چال ڈھال میں میانہ روی کا پہلو نمایاں ہونا چاہئے۔ سورۂ لقمان میں جہاں نماز قائم کرنے، عجز وانکساری، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، صبروتحمل اور لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آنے کی تاکید کی گئی ہے وہاں اعتدال کی چال کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ (5)

---

(1) القرآن، ۹:۲۴ (2) صحیح المسلم، کتاب لاشربہ، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہٖ، ص۱۸۳

(3) غزوۂ احد کا معروف واقعہ، جسمیں صحابہ کرام نے حالت نزع میں پانی ایک دوسرے کو پیش کیا تھا۔

(4) القرآن، الاسراء، ۱۷:۱۱۰ (5) ایضاً، ۳۱:۱۹

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ سارے مذاہب میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مساکین اور ناداروں کی مالی مدد کرنے کو قابل تعریف سمجھا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی افراط وتفریط دونوں سے منع کیا ہے۔ ایک طرف بخل کی مذمت کی ہے تو دوسری طرف اسراف کو ناپسند اور تبذیر کرنے والے کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے (1) یہ بھی بتایا ہے کہ اپنا سب کچھ دوسروں کو دیکر خود محتاج رہنا قابل تعریف نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (2)

اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا بیٹھ جائے۔

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (3)

اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور ہو اس کے درمیان اعتدال سے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کرسکو (4) یعنی یہ کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھاسکتے ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔ اس کی وضاحت آپؐ نے ایک اور موقع پر یوں فرمائی ہے کہ دولتمندی میں اعتدال کتنی اچھی ہے، محتاجی میں اعتدال کتنی اچھی ہے عبادات میں اعتدال کتنی اچھی ہے (5)

خودداری

اللہ تعالیٰ انسان کو دیگر بہت سی مخلوقات پر برتری دی ہے، لیکن وہ اپنی اس حقیقت کو صرف اسی وقت پہچان سکتا ہے جب وہ اپنی ذاتی شرف کو سمجھ لے اور اپنی آپ کو پستی، ذلت اور شہوانی خواہشات اور غلامی سے

---

(1) القرآن، ۲۶:۱۷ (2) ایضاً، ۲۹:۱۷ (3) ایضاً، ۶۷:۲۵

(4) فتح الباری، ج ۱۱، ص ۲۶۵

(5) علاولدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی البرہان، کنز العمال فی السنن الاقوال والافعال، ج ۲، موسۃ الرسالۃ، البیروت، ۱۹۸۹ء۔ ص ۷

اسلام میں صفائی اور طہارت کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا بنیادی مقصد بھی یہ ہے کہ اس سے انسان کی عزت اور وقار میں آضافہ ہوتا ہے۔ صاف ستھرا ور پا کیزہ طرز معاشرت انسان کو محبوب جبکہ غلاظت و گندگی سے انسان کو نفرت ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو دیکھا جس کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ کیا اس کے پاس بال ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا کہ کیا کپڑے دھونے کیلئے اس کو پانی میسر نہ تھا۔ ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا تو فرمایا کہ تمھارے پاس کچھ مال ہے؟ اس نے کہا کہ اونٹ، بکری، گھوڑے سب کچھ ہے اس پر آپؐ نے فرمایا کہ جب خدا نے مال دیا ہے تو خدا کے اس فضل و احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔ (1)

معاشی تنگدستی اور فقروفاقہ میں انسان اپنی خودداری اور عزت وقار قائم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ بنیادی ضروریات کی فقدان کی صورت میں مجبور ہوتا ہے کہ دوسروں کے سامنے دست دراز کرے جس سے انسان کی خودداری ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ایک طرف دولتمندوں کو تاکید کی گئی ہے، ان پر لازم قرار دیا ہے کہ وہ محتاجوں اور مساکین کا خیال رکھے، ان کو کھلانے پلانے کی ترغیب دی گئی ہے تو دوسری طرف سوال کرنے اور مانگنے سے منع کیا گیا ہے کہ اس سے انسان کی خودداری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو فقر وفاقہ کی صورت میں بھی خودداری کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں اس خودداری کو جس کا ظہار فقر وفاقہ کی صورت میں کیا جاتا ہے، تعفف اور استعفاف کا نام دیکر اس کو ایک قابل ستائش اخلاقی وصف بتایا گیا ہے۔ اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بناء پر اللہ تعالیٰ اصحاب صفہ کے بارے میں فرمایا:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا(2)

(خیرات تو) ان حاجمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر سے دور بیٹھے ہیں، ایک میں کسی کی طرف جانہیں سکتے ہیں بے خبر ان کو ان کی خود داری کی وجہ سے غنی سمجھتا ہے۔ تو ان کی صورت سے ان کو پہچان جائے، وہ لپٹ کرنہیں مانگتے۔

سوال کی سب سے متبذل صورت گداگری کی ہے، اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت

---

(1) امام ابو داؤد، سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی الخلقان وفی غسل الثوب، ص۲۶۲

(2) القرآن، ۲:۲۷۳

کی ہے ایک حدیث میں ہے کہ جوشخص ہمیشہ بھیک مانگتا ہے وہ قیامت کے دن اس حالت میں اٹھے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے دنیا میں اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت وآبرو گنوادی تھی، چنانچہ چند انصار نے جو بہت غریب تھے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مانگا آپؐ نے دیدیا، پھر سوال کیا تو آپ نے پھر دیدیا لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم میں سے بچا کر اس کو جمع نہیں کروں گا جوشخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جوشخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جوشخص خدا سے صبر چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔ فقروفاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرنا بھی خود داری کے منافی ہے۔ اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جوشخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی لیکن جوشخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے ممکن ہے خدا اس کو بے نیاز کردے۔ (1)

مختصر یہ کہ اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کیلئے ایمان سے بڑھ کر کوئی اور شئے باعث عزت و افتخار نہیں ہوتی ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کیلئے ہے اور اس کی عطا سے رسول کیلئے اور اس کے واسطے مسلمانوں کیلئے ہے۔ اس کے نزدیک خودداری کو قائم رکھنا اسلام کو قائم رکھنا ہے۔

استقامت

انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اعلیٰ مقاصد کے حصول کیلئے انتھک محنت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، طرح طرح کی ناکامیوں، مشکلات اور مصائب سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ لوگ کامیاب اور بامراد ہوتے ہے جو ان تکالیف ااور مصائب کو برداشت کرتے ہوئے اپنے مقصد پر قائم رہتے ہیں۔ اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں حریت اور آزادی، معاشی خود کفالت اورخوشحالی اور معاشرتی تکمیل وترقی کا حصول ارادۂ اجتماعی اور جدوجہد مسلسل کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے وہ اقوام اور معاشرے جو مقاصد کے تعین اور صبر وحوصلہ اور مستقل مزاجی کی جوہر سے عاری ہوں، ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہتے ہیں۔

مذہبی نقطہ نظر سے انسان کی پوری زندگی خیر وشر کے درمیان کشمکش سے عبارت ہے۔ خالق کی رضاجوئی اوردنیا وآخرت میں فلاح ونجات وہ انسان پا سکتا ہے جوکلمہ حق پر استقامت اور پامردی کیساتھ ثابت قدم رہ سکتاہے۔ اس لئے ہرمعاشرے اورمذہب میں راہ حق پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا

---

(1) امام ابوداؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ، باب کراہۃ المسئلۃ وباب فی الاستعفاف، ص۶۶۹، ۶۷۰

ہے کہ صرف وہ لوگ گھاٹے اور خسارے میں نہیں ہے جو ایمان اور عمل صالح کیساتھ حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے ہتے ہیں (1)

استقامت سیدھا رہنے یا چلنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں استقامت یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے مشکلیں پیش آئیں مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرے کو برداشت کیا جائے مگر حق بات سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کیساتھ چلا جائے۔ معاشرتی زندگی میں اہداف اور مقاصد کا تعین سب سے مقدم اور ضروری ہوتا ہے اس لئے ایک اسلامی معاشرہ کے قیام کیلئے بھی ضروری ہے کہ سب سے پہلے اہم مقاصد کا تعین کیا جائے۔ چونکہ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کا اولین مقصد ایک الہ کی عبادت اور اس کی رضا ہے اس لئے نبی کریم ﷺ کو سب سے پہلے اس اعلان کا حکم ہوتا ہے۔

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ(2)

تمہارا معبود ایک ہی ہے سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔

یعنی یہ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کی عبادات اور توجہات کا مرکز ایک ہی ہو۔ یہی ایک الہ کی عبادت اسلامی معاشرہ کی وحدت اور یگانگت کا سرچشمہ ہے جس کو اللہ کی رسی سے تشبیہ دی گئی ہے اور تمام مسلمانوں کو مضبوطی سے پکڑنے کی تاکید کی گئی ہے، ہر مومن کو اسی کی طرف چلنے اور صرف اسی کے سامنے جھکنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

جس طرح ہر تحریک اور مذہب کو ابتداء میں مزاحمت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے پیروں کاروں کو استقامت اور استقلال کی تاکید کی جاتی ہے اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد جب اسلامی معاشرہ کی بنیاد ڈالی گئی تو مسلمانوں کو بھی سخت اذیت اور تکالیف سے گزرنا پڑا اسی موقع پر اللہ کی طرف سے نبی کریم ﷺ اور تمام ساتھیوں کو راہ حق پر ثابت قدم رہنے کا حکم ہوا۔ ارشاد ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا(3)

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف وخطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے، کامیابی کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ ان کو کسی قسم کا خوف وحزن دامن گیر نہیں ہوگا۔ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

---

(1) القرآن، ۳:۱۰۴ (2) ایضاً، ۶:۴۱

(3) ایضاً، ۱۱:۱۱۲

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ(1)

بیشک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس قائم رہے تو ان کو کوئی خوف وحزن نہیں ہوگا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں اولوالعزم افراد کی استقامت اور ثابت قدمی وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا، اور جب تک کوئی شخص یا قوم اس پر پوری نہیں اترتی کامیابی کا زینہ طے نہیں کرسکتی اس لئے قرآن مجید میں مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ جس طرح تم سے پہلے قوموں نے ازمائش میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرکے کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح تم بھی مختلف آزمائشوں کے دوران استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کرکے نجات اور کامیابی حاصل کرسکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ(2)

کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤگے اور ابھی تم پر تم سے پہلے کے احوال نہیں آئے ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی، اور جھڑجھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کیساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی سن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق راہ حق میں صبر و استقامت اور پامردی کسی بھی انسان کی موت وحیات کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ انسان اعلیٰ مقاصد کیلئے حق وصداقت کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ جم جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مومنین کو بتایا گیا ہے کہ اگر رسول مرجائے یا مارا جائے تو بھی انہیں دین حق پر استقامت کے ساتھ کاربند رہنا چاہئے۔ ایک اور مقام پر یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ مومنین کو تکالیف اور مصائب پر صبر استقامت کے ساتھ نماز اور دوسرے اعمال صالحہ پر کاربند رہنا چاہئے اس لئے کہ فلاح ونجات اعمال صالحہ پر استقامت کیساتھ عمل پیرا ہونے میں مل سکتی ہے۔ (3)

---

(1) القرآن، ۴۶:۱۳ (2) ایضاً، ۲:۲۱۴

(3) ایضاً، ۳: ۱۵۰ اور ۷۰: ۱۸ تا ۳۵

انہی قرآنی آیات اور نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں ہر قسم کے مصائب اور آزمائشوں میں استقامت اور ثابت قدمی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ ہر قسم کی مالی اور جانی آزمائشوں کا پامردی سے مقابلہ کیا لیکن راہ حق سے منہ نہ موڑا۔ جس کے نتیجے میں اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں لایا گیا اور پوری جمیعت بشری پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اور انسانی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا۔

خوش کلامی

انسان اور دیگر حیوانات میں ما بہ الامتیاز نطق کی صفت ہے۔ اسی وجہ سے انسان کو دسرے حیوانات پر برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ تمدن بشری کی نشوونما اور ترقی میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اوسوالڈ سپینگلر کے مطابق زبان انسان کے اس شعور بیدار، باہمی تعلق اور استدلال کا نام ہے جس کے ذریعے ایک انسان دوسرے انسان کے شعور بیدار سے رابطہ کرلیتا ہے۔ (1)

خوش کلامی یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کے ساتھ ہمکلام ہونے کی صورت میں باہمی کے ادب واحترام اور لطف ومحبت کا پہلوملحوظ رکھے، تاکہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیداہوں اور باہم مروت اور محبت بڑھے۔ سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں۔ ہر مذہب میں خوش کلامی کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآن میں دہرایا گیا ہے کہ لوگوں کیساتھ اچھی بات کہا کرو۔ (2) ایک اور آیت میں بتایا گیا ہے کہ اچھی بات کہنا نیک بندوں کی صفت ہے جبکہ انسانوں کے درمیان نفرت اور لڑائی جھگڑے پیدا کرنا شیطان کا کام ہے۔ (3)

خوش کلامی اور اچھی بات کہنے سے افراد کے درمیان باہمی ربط اور محبت و الفت پیدا ہوتی ہے جبکہ بدگوئی اور بدکلامی سے افراد کے درمیان پھوٹ پڑتی ہے، اس سے نفرت، حسد اور نفاق کے جذبات پیداہوتے ہیں۔ اس لئے اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کو نیک اور اچھی بات کہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ معاشرہ میں نفاق اور نفرت کی ایک وجہ افراد کے درمیان طبقاتی کشمکش اور ایک دوسرے حقیر سمجھنا ہے جس کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے مثلاً کسی کو نسل، رنگ یا مذہب کی بناء پر تحقیرآمیز القاب سے پکارنا یا کسی جرم و گناہ کی عار دلانا وغیرہ۔ اس لئے قرآن مجید میں تنابز و بالالقاب کی ممانعت آئی ہے۔ ارشاد ہے:

---

(1) اسوالڈ سپینگلر، زوال مغرب، ج ۲، ص ۱۵۳

(2) القرآن، ۲:۸۳۔ (3) ایضاً، ۱۷:۵۳۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ، بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ(1)

اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں سے پکارو، ایمان کے گنہگاری برا نام ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی ہے اور اس کو جان سے مارنا کفر ہے۔ (2)ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو اللہ اور وز جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے(3)

نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں ایک مسلمان کی شان اس قسم کے غیر مہذب اور ناشائستہ کلام سے بہت اونچی ہونی چاہئے۔ اس کی زبان سے حق وصداقت، بہبودی وخیر خواہی اور نیکی وبھلائی کے سوا کوئی بات نہ نکلے۔ اسی طرح اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے والا سمجھتا ہے کہ کلمہ خیر کے سوا نکلنے کی صورت میں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ دوزخ سے بچو اگرچہ چوہارے کی خیرات سے ہو اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے۔ (4)

جس طرح صدقہ سے کسی غریب اور محتاج کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاسکتی ہے اسی طرح اچھی اور نیک بات سے بھی محتاج کی دادرسی کی جاسکتی ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اچھی بات بھی صدقہ ہے۔ (5)

مختصر یہ کہ خوش کلامی سے معاشرتی زندگی میں الفت ومحبت کے جذبات نشوونما پاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ اس کا عملی نمونہ تھے۔

---

(1) القرآن، ۱۱:۴۹۔

(2) صحیح البخاری، ج ۴، باب، ماینھی عن السباب واللعن، ص ۲۷۳۔

(3) صحیح المسلم، کتاب الایمان، ص ۸۵۔

(4) محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری، کتاب الادب، باب طیب الکلام، ص ۲۶۴۔

(5) ایضاً، باب کل معروف صدقۃ، ص ۲۶۴۔

فصل ہشتم

اسلام اور طبقات انسانی کا تصور

انسانی معاشرہ باوجود اپنی وحدت کے اپنے اندر گروہوں، طبقوں اور مختلف اصناف میں کہ جہاں متضاد صورتیں بھی نکل آتی ہیں، تقسیم ہے۔ یہ صورت حال اگر کلی نہیں تو کم ازکم بعض معاشروں میں کافی گہری ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ وحدت کے ساتھ کثرت اور کثرت کے ساتھ عین وحدت کا حامل ہے۔ انسانی معاشرہ کے مختلف گروہوں، طبقوں اور اصناف میں تقسیم کے اسباب اور علل کیا ہیں ؟انسانی معاشرہ کے وحدت اور کثرت کی نوعیت کیا ہے ؟نیز انسانی معاشرہ اور طبقاتی تقسیم کے بارے میں اسلامی تصورات کیا ہیں ؟ذیل کے سطور میں انہی نکات پر بحث کی جائے گی تا کہ نظریاتی، جغرافیائی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم انسانی معاشرہ میں اسلامی معاشرت اور اجتماعی طرز زندگی کی واضح تصویر سامنے آسکے۔

نوع انسان کی طبقات میں تقسیم کے بارے میں عام طور پر دو نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریے کی بنیاد تاریخی مادیت اور جدلیاتی تضاد پر ہے۔ اس نظریے کے مطابق نوع انسان کا مختلف طبقات میں تقسیم ہو نا اصول ملکیت کی بنیاد پر ہے۔ اس نظریہ کے حامی اور پیرو کار تاریخی مادیت اور جدلیاتی تضاد کی روشنی میں انسانی معاشرہ کی تشریح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ابتدائی انسانی معاشرہ ہر قسم کے تضادات، طبقات اور معاشرتی ناہمواریوں سے پاک معاشرہ تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک وقت تک جاری رہا جب تک انسانی معیشت کا دارومدار شکار پر تھا۔ شکار گیر معاشرہ میں مرد وزن اور ہر فرد کا سماجی رتبہ برابر تھا۔ تاہم معاشرتی ترقی اور زرعی معاشرہ کے آغاز سے جب نجی ملکیت کی ابتداء ہوئی تو انسانی معاشرہ دوطبقوں میں بٹ گیا ایک استحصال کرنے والا اور دوسرا استحصال ہونے والا، ایک حاکم اور دوسرا محکوم طبقہ معرض وجود میں آیا۔

ذاتی ملکیت کی بنیاد پر پروان چڑھنے والے معاشرے چونکہ دومختلف طبقاتی نظام کے حامل ہوتے ہیں اور کوئی تیسرا گروہ یا طبقہ موجود نہیں ہوتا اسلئے آرٹ، فلسفہ، اخلاق اور مذہب جیسے دیگر معاشرتی امور میں بھی اسی طبقاتی نظام کا رنگ کا نمایاں ہوتا ہے، مثلاً دوطرح کا فلسفہ، دوطرح کا اخلاقی نظام اور دوطرح کے مذہب وغیرہ معاشرے پر حاکم ہو جاتے ہیں اور ہر ایک کسی مخصوص اقتصادی طبقے کا رنگ اپنے اوپر چڑھا لیتا ہے، اگر بالفرض ایک فلسفہ، ایک مذہب اور ایک اخلاقی نظام معاشرے پر حاکم ہو تو بھی یہ انہی دو طبقات کے رنگوں میں سے کسی ایک کا رنگ ہو گا جسے دوسرے طبقے پر تھوپا گیا ہو گا۔

اس نظریے کی بنیاد تاریخی مادیت پر رکھی گئی ہے جس کے دو اہم نکات ہیں، ایک ہویت تاریخ کا مادی

ہونا اور دوسرا اس کی حرکات کا جدلیاتی ہونا۔ تاریخ کے مادی ماہیت رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کی تمام تحریکیں، شعبے اور مظاہر اس کی اقتصادی تنظیم کا حصہ ہیں، یعنی اس معاشرے کی پیداوار کی مادی قوتیں اس کے پیداواری روابط کی کیفیت ہیں، جو اخلاق، علم، فلسفہ، مذہب قانون اور ثقافت وغیرہ سے متعلق معاشرے کی تمام روحانی حقیقتوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ جدلیاتی وجود کا مفہوم یہ ہے کہ تاریخ کا ہر مظہر اور واقعہ جبری طور پر اپنی نفی اور انکار کو اپنے وجود میں پرورش دیتا ہے اور ان مختلف تبدیلیوں کے بعد جو داخلی تضاد کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں، وہ مظہر ایک شدید کیفی تغیر کے بعد دوسرے مرحلوں کی نسبت زیادہ بلند مرحلے میں تکامل پاتا ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کسی معاشرے کی ایک طبقے یا کئی طبقوں سے وابستگی کا انحصار مالکیت کے قانونی اصول پر نہیں بلکہ ثقافتی، اجتماعی نسلی، اور نظریاتی علل و اسباب بھی معاشرے کو کئی طبقوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ خاص طور پر ثقافتی اور نظریاتی اسباب اس میں خاص کردار ادا کرتے ہیں اور معاشرے کو ایک نہیں بلکہ کئی متضاد طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے کو اصل ملکیت کے اصول کے لازماً رد کئے بغیر ایک طبقاتی معاشرے میں تبدیل کی جا سکتا ہے۔

اب یہ کہ معاشرے کی کثرت کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا وہ کثرت و اختلاف کو تسلیم کرتا ہے کہ نہیں؟ اور اگر تسلیم کرتا ہے تو کیا اس کے نزدیک معاشرہ دو طبقوں کا حامل ہے اور وہ بھی ملکیت اور استحصال کی بنیاد پر یا کوئی دوسری صورت بھی اس کے پیش نظر ہے؟ اس لئے ضروری ہے کہ معاشرے اور اجتماع سے متعلق قرآنی الفاظ کا استخراج کر کے ان کے مفاہیم پر غور کیا جائے۔

معاشرتی حوالے سے قرآنی الفاظ کی دو قسمیں ہیں بعض کا تعلق معاشرتی آثار سے ہے جیسے ملت، شریعت، شرعہ، منہاج اور سنت وغیرہ، جس پر مقالہ ہذا کے باب دوم میں دین اور ملت کے موضوع کے تحت بحث کی گئی ہے، لیکن الفاظ جو سب کیلئے یا بعض انسانی گروہوں کیلئے اجتماعی عنوان کے حامل ہیں، جن سے صحیح طور سے قرآنی نقطہ نگاہ کی وضاحت ہو سکتی ہے، وہ قوم، امت، ناس، شعوب، قبائل، رسول، نبی، امام، مومن، کافر، منافق، مشرک، مذبذب مہاجر، مجاہد، صدیق، شہید، متقی، صالح، مصلح، مفسد، آمر بالمعروف، ناھی عن المنکر، عالم، ناصح، ظالم، خلیفہ، ربانی، ربی، کاہن، رہبان، احبار، جبار، عالی، مستعلی، مستکبر، مستضعف، مسرف، مترف، طاغوت، ملاء، ملوک غنی، فقیر، مملوک، مالک، جبر، وغیرہ جیسے الفاظ ہیں۔ اس کے علاوہ ان سے مشابہ الفاظ بھی ہیں جیسے مخلص، صادق، منفق، مستغفر، تائب، عابد، وغیرہ، لیکن یہ الفاظ جماعتوں اور گروہوں سے ہٹ کر صرف ایک طرح کے افعال کو ذکر کرنے کیلئے آئے ہیں۔

ان قرآنی آیات کا، جو اجتماعی رخ کو متعین کرتی ہے، اور انسان کو اجتماعی اور معاشرتی اساس فراہم کرتی ہے، اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس طرح انسان روح اور جسم کا مرکب ہے،

انسانی زندگی روح اور جسم کی یکساں محتاج ہے اسی طرح انسانی معاشرہ روحانی اور مادی لحاظ سے دو طبقات میں تقسیم ہے۔ قرآنی آیات کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

(۱) قرآنی آیات کے مطابق معاشرہ دو طبقاتی نوعیت کا حامل ہے۔ قرآن ایک طرف معاشرہ میں دو طبقاتی کیفیت کو مادی اساس پر یعنی مادی استفادہ اور مادی محرومیوں کی بنیاد پر پیش کرتا ہے اور ان میں سے ایک کو ملاء (صاحب جاہ و جلال وتمکنت) مستکبر، مسرف، اور مترف اور دوسرے طبقے کو مستضعف، (ضعیف و کمزور قرار دیئے جانے والا) ناس، ذریہ، اور ارذلون کے عناوین سے یاد کرتا ہے اور ان دو طبقوں کو ایک دوسرے کے مقابل قرار دیتا ہے، جبکہ دوسری طرف معاشرے کی دو طبقاتی کیفیت کو معنوی مفاہیم کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ ان میں ایک طبقہ کافروں، منافقوں، فاسقوں اور مفسدوں کا ہے اور دوسرے طبقے میں مومنین، موحدین، متقین، مجاہدین اور شہداء شامل ہیں۔ قرآنی آیات کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ پہلے مادی طبقے، پہلے معنوی طبقے اور اسی طرح دوسرے مادی طبقے اور دوسرے معنوی طبقے میں ایک قسم کی مطابق پائی جاتی ہے۔ یعنی کافروں، مشرکوں اور منافقوں کا گروہ، مستکبروں، مسرفوں، مترفوں طاغوتوں اور ملاء کے مفہوم میں آنے والے لوگوں کا گروہ ہے کوئی اس سے الگ نہیں ہے۔

پس مجموعی طور پر معاشرہ دو طبقات پر مشتمل ہے ایک بہرہ مند، ظالم، اور استعمارگر طبقہ جس میں تمام کافرین آتے ہیں اور دوسرا مستضعف گروہ جو مومنین سے مرکب ہے۔ مزید یہ کہ مستضعف بنانے کا عمل شرک، کفر، نفاق اور فسق وفجور سے ابھرتا ہے اور استضعاف شدگی ایمان، توحید اور تقویٰ سے ظہور پذیر ہوتی ہے، جس کی تفصیل سورۂ اعراف کی ان چالیس آیات میں ملتی ہے جو انسٹھویں آیت لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ سے شروع ہو کر ۱۳۷ویں آیت وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ پر ختم ہوتی ہے۔ ان آیات میں حضرات نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، شعیبؑ، اور موسیٰؑ اور ان کے قوموں اور معاشروں کا تذکرہ ہے، جن میں سوائے لوطؑ کے واقعے کے یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ان تمام انبیائے کرام پر ایمان لانے والے لوگ مستضعف طبقے سے تعلق رکھتے تھے جبکہ جن لوگوں نے مخالفت کر کے کفر اختیار کیا ہے ان کا تعلق ملاء اور مستکبر طبقہ سے رہا ہے۔

قرآن اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ کثرت مال، جو کہ عام طور پر دوسروں کی استحصال اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کی علامت ہوتی ہے، طغیان اور سرکشی کا باعث ہے۔ یعنی یہ تواضع، فروتنی، اور سلم کی ضد ہے جس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى(1)

---

(1) القرآن، ۹۶:۶، ۷

اور جب اپنے آپ کو بے نیاز اور دولتمند محسوس کرنے لگتا ہے، تو باغی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح قارون کے بارے میں بھی قرآن یہی بتاتا ہے کہ اس کا تعلق موسیٰ کی قوم سے تھا لیکن مال ودولت کی کثرت کی بناء پر مستکبرین میں شامل ہو کر موسیٰ کی مخالفت پر اتر آیا۔ قرآن کہتا ہے اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی فَبَغٰی عَلَیْهِمْ (1) قارون، موسیٰؑ کی قوم کا ایک فرد تھا، جس نے بنی اسرائیل کے اپنی مستضعف قوم کے خلاف ظلم کیا۔

(۲) قرآن کے مطابق انبیاء کی بعثت اور قیام کا مقصد روحانیت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں عدل، قسط، برابری اور مساوات قائم کرنا اور طبقاتی فاصلوں کے درمیان حائل دیوار کو توڑنا ہے۔ تمام انبیاء نے ہمیشہ عقائد اور روحانیت کو بنیاد بنا کر اس پر اقتصادیات، اخلاقیات، اور معاملات کی عمارت قائم کی ہے، مادیت اور روحانیت میں توازن قائم کی ہے۔ معاش اور معاد کو باہم لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ دنیا وآخرت کی بھلائی کی تلقین کی ہے۔

(۳) انبیاء نے اعتقادی توحید اور اخلاقی اور عملی تقویٰ کو بنیاد بنا کر معاشرے کو اجتماعی شرک، بے جا امتیازات، اتحصال اور استضعاف شدگی جیسے اخلاقی، عملی اور اعتقادی شرک سے نجات دلائی۔

(۴) قرآن انبیاء کے مخالفین کی منطق کو پوری تاریخ میں انبیاء اور ان کے پیروکاروں کی منطق کے مقابل قرار دیتا ہے اور بڑی وضاحت سے اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مخالفین کی منطق ہمیشہ سے قدامت پرستانہ اور رجعت پسندانہ رہی ہے۔ مخالفین کا چونکہ ہمیشہ سے تعلق معاشرہ کے استحصالی طبقہ سے رہا ہے اس لئے ان کی پوری کوشش یہ رہی ہے کہ معاشرہ اسی حالت پر قائم رکھا جائے جبکہ انبیاء کی دعوت معاشرہ میں تبدیلی لانے کیلئے تھی۔ قرآن نے مخالفین کی رجعت پسندانہ اور عقل و دانائی سے محروم منطق یوں بیان فرمائی ہے:

اور انہوں نے کہا: اگر خدا چاہتا کہ ہم فرشتوں کی عبادت نہ کریں تو ہم نہیں کرتے، یہ اس قسم کی گفتگو ازروئے دانائی و ادراک یا علمی ومنطقی بنیاد پر نہیں کرتے یہ صرف فرض وتخمین سے کام لیتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے ان کیلئے کوئی ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں کسی قسم کی جبریت پر مبنی بات ہو، اور انہوں نے اسے اختیار کیا ہو، بلکہ ان کا اصلی قول یہ ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے بس وہی ہماری راہ ہے۔ (نبی کریم ﷺ) نے ان سے فرمایا کہ اگر میں تمہاری لئے کوئی ایسی راہ اور طریقہ پیش کروں جو تمہارے باپ دادا کی راہ سے بہتر ہو پھر بھی تم اپنے باپ دادا کی روش پر قائم رہو گے؟ انہوں نے کہا بہرحال ہم تمہارے پیغام اور تمہاری رسالت کے منکر ہیں۔ (2)

---

(1) القرآن، ۲۸:۷۶

(2) ایضاً، ۴۳:۲۰ تا ۲۴

(۴) طبقاتی معاشرہ میں مستضعفین اور مستکبرین کی اویزش اور اس کے نتائج کے بارے میں قرآنی نقطہ نظر یہ ہے کہ قدامت پسند اور مستکبرین طبقہ کے مقابلہ میں اولوالعزم مستضعفین طبقہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا اور زمین کا وارث بنے گا:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ(1)

اور ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ مستضعفین پر احسان سے کام لیں اور انہیں پیشوا اور زمین کا وارث قرار دیں

سورۂ اعراف میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے، ارشاد ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآئِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ(2)

ہم نے موعودہ برکت والی سرزمین کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ان لوگوں کے حوالے کیا جنہیں زمین پر کمزور بنایا گیا تھا، بنی اسرائیل کے بارے اللہ کا وعدہ ان صبر کے مظاہرے کی بناء پر بحسن وخوبی پورا ہوا، اور جو کچھ فرعون اور اس کی قوم نے انجام دیا تھا، ان کی تمام بنائی ہوئی اور پیش کی ہوئی چیزوں کو ہم نے نیست ونابود کر دیا۔

ایک طرف اگر قرآن میں دوطبقاتی یعنی استحصالی اور استحصال شدہ معاشرہ کی مثالیں دی گئیں ہیں اور بتایا ہے کہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ مستضعفین اور تاریخ کے بے بس لوگوں کو بطور کلی امامت و وراثت عطا کرے اس لئے تمام رہبر، تمام پیشوا تمام پیغمبر مستضعف طبقے سے ابھرتے ہیں، یہ کہ ہمیشہ فکری مرکزوں، اجتماعی بنیادوں اور طبقاتی موقفوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے تو دوسری طرف قرآن اپنے تذکرہ تاریخ میں ایسے افراد بھی پیش کرتا ہے جنہوں نے ملاء ومستکبر طبقے سے ابھر کر اسی طبقے کے خلاف قیام کیا۔ مثلاً آل فرعون میں اس مومن کا واقعہ جو حکمران طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود فرعون کا فکری مخالف رہا اور موسیٰؑ کی بھر پور حمایت کرتا رہا(3) اس کے علاوہ فرعون کی بیوی جو کہ ہر قسم کی دنیاوی لذائذ سے بہرہ مند تھی، پھر بھی نبی کی پیغام پر ایمان

---

(1) القرآن، ۲۸: ۵ (2) ایضاً، ۷: ۱۳۷ (3) ایضاً، ۴۰: ۲۸تا۵۰

لے آئی۔ (1)قرآن نے فرعون کے جادوگروں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انسان کی فطری حق جوئی اور حقیت خواہی حق وحقیقت کے ساتھ جھوٹ، زور، زبر دستی اور گمراہی کے خلاف شورش کرتی ہے، اپنے مفاوات کوٹھوکر لگا دیتی ہے اور کوئی بھی دھمکی اور خوف ان کو حق کا ساتھ دینے سے نہیں روک سکتی۔ (2)

انسانی معاشرہ کی وحدت اور کثرت کی نوعیت

وحدت وکثرت، یگانگت اور تنوع انسانی معاشرہ کا ہمیشہ سے جزو لا ینفک رہا ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں ایک کو بھی کلی طور پر نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ فطری کثرت کو طبقاتی اویزش میں تبدیل کر کے نوع انسان کا استحصال کیا گیا ہے۔ اہل فکر ونظر کے سامنے یہ سوال ہمیشہ سے موجود رہا ہے کہ وحدت وکثرت میں اصالت کس کو حاصل ہے؟ کیا تمام انسانی معاشرے ایک نظریہ حیات کے تابع ہو سکتے ہیں یا معاشروں کا تنوع مختلف نظریہ ہائے حیات کی پیداوار ہے اور ہر قوم، ہر ملت، ہر تمدن اور ہر ثقافت کو ایک خاص نظریہ حیات کی ضرورت ہے؟ اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے انسان کے حیاتیاتی اور عمرانیاتی پہلو پر غور کیا جائے اس کے بعد قرآنی نقطہ کی وضاحت کی جا سکے گی۔

علم حیاتیات کی رو سے انسان نوع واحد ہے۔ انسان جب سے وجود میں آیا ہے اس میں کوئی حیاتیاتی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے، گو کہ بعض ماہرین حیاتیات کا کہنا ہے کہ عالم طبیعت میں جانداروں کے کمال کے نتیجے میں انسان بن گیا ہے اور انسان تک پہنچ کر طبیعت نے راستہ بدل لیا اور ارتقائی عمل زیست سے اجتماع میں منتقل ہو گیا اور اس کا ارتقائی عمل جسمانی سے روحانی اور معنوی گزرگاہ میں منتقل ہو گیا۔ (3)

عمرانیاتی نقطہ نظر سے انسان مدنی الطبع ہے۔ انسان کا اجتماعی رجحان اور اس کا گروہ و جماعت کی صورت میں رہنا اور اس کا اجتماعی فکر کا حامل ہونا اس کی نوع اور ذات کا خاصہ ہے اور یہ انسانی نوع کی فطری خواص میں سے ہے۔ چونکہ انسان نوع واحد اور فطری اجتماعی میلان رکھتا ہے اس لئے انسانی معاشرے بھی یکساں طبیعت اور یکساں ماہیت کے حامل ہیں۔ البتہ جیسے فرد کبھی فطرت کے رستے سے منحرف ہو جاتا ہے بلکہ مسخ بھی ہو جاتا ہے اسی طرح معاشرہ بھی کبھی اپنے فطری راستے کو چھوڑ دیتا ہے۔ انسانی معاشروں کی تنوع اور کثرت انسان کی اخلاقی تنوع کی طرح ہے جو کسی بھی صورت میں انسان کے نوع ہونے کے دائرے سے باہر نہیں ہوتا لہٰذا معاشرے، ثقافتیں، تہذیبیں مختصر یہ کہ اجتماعی روح جو معاشروں میں حکم فرما ہے اپنے ڈھانچے اور اپنی رنگت میں اختلاف کے

---

(1) القرآن، ۲۶: ۱۱ (2) ایضاً، ۷: ۱۱۳ تا ۱۲۶

(3) ڈارون اور اس کے پیروکار اسی نظریئے کے قائل ہیں۔

باوجود انسانی نوع کی حامل ہوتی ہے۔

قرآنی تعلیمات کی رو سے انسانی معاشرہ میں وحدت کو اصالت دی جاتی ہے اس لئے کہ انسان کو کمال اور اس تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ بتایا گیا ہے، نوع انسان کیلئے ایک ہی دین نازل کیا گیا ہے۔ قرآن اصرار اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ دین تمام علاقوں، معاشروں وقتوں اورزمانوں میں ایک سے زیادہ نہیں رہا ہے۔ تمام انبیاء ایک ہی دین، ایک ہی راستے اور ایک ہی مقصد کی طرف انسانوں کو بلاتے رہے ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (1)

تمہارے لئے اس نے دین کی وہی باتیں مقرر کیں جن کی بابت اس نے نوح کو وصیت کی تھی اور (اے رسول) جس کی بابت ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے اور جس کی بابت ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی تھی۔ وہ یہی تھی کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف مت ڈالو۔

اسلام انسانی معاشرہ میں موجود فطری کثرت اور تنوع کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ نوع بشر کی قبیلے، برادری، خاندان میں تقسیم اور ان میں فکر ونظر اور رنگ ونسل اور جغرافیائی اختلاف کو فطری قرار دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان چونکہ مدنی الطبع ہے، اجتماعی روح اس کی فطری ضرورت ہے اس لئے انسان کو مرد وزن سے پیدا کر کے قبیلے، برادری اور خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم نوع بشر کیلئے وجہ افتخار یا ندامت نہیں بلکہ ذریعہ پہچان ہے۔ فکری تفاوت اور رنگ ونسل کا فرق وہ بنیادی وسیلہ ہے جس کے بغیر باہمی ربط، تبادلہ خیال اور اجتماعی زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ قرآن کی نظر میں تمام انسان ایک آدم کی اولاد اور نوع واحد ہے اس لئے بحیثیت انسان سب برابر ہیں ان میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (2)

اے لوگو ہم نے تم کو مرد وزن سے پیدا کیا اور تم میں قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک اللہ کے نزدیک سب سے

---

(1) القرآن، ۴۲: ۱۳ (2) ایضاً، ۴۹: ۱۳

عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تاریخی لحاظ سے انسانی معاشرہ مادی اور روحانی اعتبار سے طبقات اور گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ نوع بشر میں فکری تفاوت اور رنگ ونسل اور جغرافیائی اختلافات وجہ تکریم اور تحقیر نہیں بلکہ ذریعہ پہچان اور اجتماعی روح کی فطری ضرورت ہے۔ نوع واحد ہونے کی بناء پر جمیعت بشری کو وحدت حاصل ہے اس لئے کمال انسانیت کا راستہ ہمیشہ سے ایک رہا ہے۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد انسانی معاشرہ میں موجود مادی اور روحانی تضادات اور طبقات کا خاتمہ اور سب انسانوں کو بلا امتیاز ایک ہی دین ایک ضابطہ اخلاق اور ایک، یکساں اور مساوی اجتماعی زندگی کی دعوت دینا رہا ہے۔

فصل نہم

معاشرتی عدل اور اس کے تقاضے

معاشرتی تنظیم اور معاشرتی عدل آپس میں مربوط اور ایک دوسرے کی ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں میں سے ایک مفروضے کی صورت میں معاشرتی خد وخال اور اساس فراہم کرتا ہے جبکہ دوسرا اس کو معین اور واضح شکل وصورت دیدیتا ہے۔ اس لئے معاشرتی عدل پر بحث، نظری ہو یا عملی، معاشرتی تنظیم کی، براہ راست یا اشارتاً، توثیق یا تنقید ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں معاشرتی عدل پر بحث معاشرتی تنظیم کی موجود یا مطلوب صورت کے بارے انسانی ذہن کی تشکیل نو کا نام ہے۔ معاشرتی تنظیم سے سماجی مراتب اور اقدار پرورش پاتے ہیں جبکہ معاشرتی عدل سے انہی اقدار کی حفاظت اوروضاحت کی جاتی ہے۔ اسلئے اسلام میں معاشرتی عدل اور اس کی اہمیت و تقاضے جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اسلام کی معاشرتی تنظیم کیا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب معاشرہ میں قبائلی شناخت، مختلف قبیلوں کا اتحاد اور باہمی کشمکش، غلامی اور تولیت کے ادارے، مشرکانہ عقائد واعمال کی تقدیس اور تنفیذ کا وہ نظام تھا جس سے اس وقت کے قبائلی شناخت، باہمی ربط اور انحصاراور حفاظت جیسے ضروریات کی تکمیل ہوتی تھی۔ اس معاشرتی تنظیم میں قبائلی شناخت اورخونی رشتوں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اسلام نے معاشرتی تنظیم میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں جس کی وجہ سے معاشرتی عدل کو نئی فکر اور نئی جہت مل گئی۔

(۱) معاشرتی تنظیم میں حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسلام سے پہلے عرب معاشرہ میں قبائیلی سربراہ اور سردار کے فیصلے کو آخری سند کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس تصور کو بدل دیا اور بتایا کہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے (1)

(۲) خونی رشتوں کی بنیاد پر قائم قبائلی معاشرہ کی جگہ عقیدہ اور مذہب کو معاشرتی بنیاد قرار دیا گیا۔ خونی رشتے کیساتھ مضبوط مذہبی رشتہ بھی قائم کیا گیا۔ تمام نوع بشر کو دو گروہوں مومن اور کافر میں تقسیم کیا گیا اور بتایا گیا کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (2)

(۳) قبائلی شناخت کی کلی طور پر تنسیخ نہیں کی گئی بلکہ عقیدے، ایمان اور تقویٰ کی شناخت کو اولیت دیکر اوّل الذکر کو اس کے ماتحت رکھا گیا۔ وجہ افتخار اور عزت وتکریم قبائلی شناخت کی بجائے تقویٰ قرار دیا گیا۔(3)

---

(1) القرآن، ۶:۵۷ (2) ایضاً، ۴۹:۱۰ (3) ایضاً، ۴۹:۱۳

(۴) پیدائشی اور نسلی شرافت اور امتیازات کا خاتمہ کیا گیا اور عقیدہ و ایمان کی بنیاد پر تمام مومنین کے درمیان مساوات، اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دیا گیا۔ یہ بھی بتا یا گیا کہ تمام مسلمان آپس میں برابر ہیں لیکن مومنین اور کافرین و ظالمین آپس میں برابر نہیں۔ حسب و نسب اور پیدائشی امتیاز کے بغیر جو زیادہ پرہیز گار ہے وہ سب سے زیادہ قابل تکریم اور عزت والا ہے۔

ان معاشرتی اقدار کی تنفیذ اسلامی قانون اور شریعت کی ذمہ داری قرار دی گئی تا کہ اس معاشرتی تنظیم کی حفاظت اور فروغ کو ممکن بنا یا جاسکے۔ اس نئے معاشرتی تنظیم کے تین بنیادی ماٰخذ الہامی، کرشماتی اور اس کی ساخت و بناوٹ تھے۔ الہامی سرچشمہ قرآن، کرشماتی منبع نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک اور اسوۂ حسنہ جبکہ ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے معاشرتی تبدیلی تھی جس نے اس نئے ترتیب و تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اسکے علاوہ یقین کامل اور اعتماد کی قوت، غیر متزلزل ہمت اور ثابت قدمی، دین اسلام کیلئے لامحدود مصائب اور تکالیف برداشت کرنے کا عزم نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے وہ ہمہ گیر پہلو ہیں جو کہ تمام نوع بشر کیلئے قابل تقلید نمونہ ہیں۔

اسلام میں معاشرتی عدل کی بنیاد بھی ان افکار اور عقائد پر استوار کی گئی ہے جن کا تعلق خالق و مخلوق، انسان اور کائنات سے ہے۔ جہاں تک خالق و مخلوق یعنی کائنات، حیات اور انسان کے مابین تعلق کا سول ہے، اس کی اصل وہ ارادہ ہے جس سے بغیر کسی فصل اور واسطہ کے ساری مخلوقات پیدا ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ(1)

اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ''ہوجا''
بس ہو جاتی ہے۔

خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ تمام مخلوقات خالق کے ارادۂ مطلق کے براہ راست نتیجہ کے طور پر بلا تاخیر وجود میں آتی ہے اسی کے مطلق اور کامل ارادۂ سے مخلوقات کا تحفظ، ان کا انتظام اور تدبیر وابستہ ہے۔ ایک ارادۂ مطلق سے صادر ہونے والا یہ وجود یعنی مخلوقات ایک مکمل وحدت رکھتا ہے، جس کا ہر جز اس طرح بنا یا گیا ہے کہ وہ دوسرے تمام اجزاء سے مناسبت رکھتا ہے۔ ہر جز میں ایک خاص حکمت پوشیدہ ہے جو ہم آہنگی وتناسب کے اس نظام کامل سے گہرا ربط رکھتی ہے۔ (2) کامل وحدت اور اور آپس میں مربوط ہونے کی بناء پر تمام مخلوقات ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں۔

---

(1) القرآن، ۳۶:۸۲

(2) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو قرآنی آیات، ۲۲:۶۵۔ ۳۶:۴۰۔ ۶۷:۱،۳،۴۔

انسان بھی اسی کائنات کا ایک جز ہے جو دوسرے اجزاء سے مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ فرد افراد نظام کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افراد انسانی بھی باہم آہنگ اور مربوط ہو کر رہیں۔ اسی بناء پر اسلام وحدت انسانیت کے نظریہ کا قائل ہے کہ اس وحدت کے اجزاء اگر مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق اور اتحاد کی خاطر، اور متفرق ہیں تو اسی لئے کہ مجتمع ہو سکیں۔ وہ مختلف راہیں اختیار کر کے بھی بالآخر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ کیونکہ وحدت کائنات کے ساتھ تعاون و ہم آہنگی سب کی منزل مقصود ہے۔ لھٰذا یہ تعاون، ہم آہنگی اور ربط باہمی وہ اصل ہے جو کہ مقصد کائنات، مقصد حیات اور خالق کائنات کے ارادۂ ومنشاء سے ہم آہنگ ہے۔ ابتداء سے لیکر آخر تک، حضرت آدم سے نبی کریم ﷺ تمام انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہی رہا ہے کہ منتشر نوع بشر کو وحدت عطا کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ(1)

شروع میں سب انسان ایک ہی امت تھے (پھر ان میں فرقہ بندی ہوئی) تو اللہ تعالیٰ نے انہیں راہ راست پر لانے کیلئے ان کی طرف نبی مبعوث فرمائے، جو انہیں خوشخبریاں سناتے تھے اور برے کاموں کے انجام سے ڈراتے تھے۔

اسلام روحانیت اور مادیت کے درمیان بھی اعتدال اور توازن کا داعی ہے۔ اس توازن کی خاطر نہ تو جسم کا مفاد مجروح ہوتا ہے اور نہ روح کا۔ اسی طرح اسلام فرد اور جماعت کے درمیان بھی اعتدال اور توازن چاہتا ہے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر یا ایک نسل کو دوسرے نسل پر ترجیح یا فوقیت نہیں دی جاتی ۔ ہر ایک کے حقوق وفرائض، عدل ومساوات کی روشنی میں واضح طور پر متعین ہیں۔ ایک ہی قانون ہے جو فرد و جماعت، طبقات واقوام اور مختلف نسلوں پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ ایک ہی مقصد ہے جو ہر جگہ اس کے سامنے رہتا ہے، یعنی یہ کہ بلا کسی تصادم اور کش مکش کے فرد اور جماعت کو پوری پوری سرگرمی دکھانے کا موقع ملے۔ ہر نسل زندگی کی تعمیر و ترقی کیلئے جدوجہد کرے اور اس کو اپنے خالق کی طرف متوجہ رکھے۔

اسلام کی بنیاد توحید پر ہے، اس لئے اسلام کائنات کی ساری قوتوں کے درمیان وحدت اور یکجہتی کیلئے کوشاں رہتا ہے۔ اس کے یہاں خدا ایک ہے، اللہ کی دین کی شکل میں سارے مذاہب کو ایک قرار دیا گیا ہے، اور آغاز حیات سے اسی دین واحد کے پیغام بر ہونے کی حیثیت سے سارے انبیاء بھی ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں

---

(3) القرآن، ۲:۲۱۳۔

ہیں۔ (1) اسی عظیم وحدت سے اسلام کے فرائض وقوانین، ہدایات وحدود اور سیاسی اور معاشی امور کے اصول وضوابط متعین ہوتے ہیں۔ اس کی روشنی میں حقوق وفرائض اور نفع ونقصان کی تقسیم ہوتی ہے۔ الغرض اس کے سارے اجزاء اور تمام تفصیلات اسی اصول میں پنہاں ہیں۔ کائنات اور انسان کے بارے میں اسلامی طرز فکر کی یہ اساس ہے جس سے اسلام میں معاشرتی عدل کے خطوط واضح ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں معاشرتی عدل کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محدود معنی میں کسی معاشی عدل کا نام نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اور جامع انسانی عدل ہے۔ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرہ میں داخل ہیں۔ اسلامی عدل فکر اور عمل، ضمیر اور وجدان سب پر چھایا ہوا ہے۔ اس کا انحصار معاشی قدروں پر نہیں۔ وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے صرف مادی قدروں تک محدود نہیں بلکہ یہ مادی، معنوی اور روحانی تمام طرح کے اقدار کے ایک خوش گوار امتزاج کا نام ہے۔ دوسری خصوصیت تعاون وہم آہنگی اور ہمدردی وموساۃ ہے۔ چونکہ تمام کائنات کا قیام توازن، تعاون وہم آہنگی پر ہے۔ اس لئے نوع بشر کی جمعیت کا قیام بھی اعتدال اور توازن پر ہے۔ فرد اور جماعت کے درمیان توازن اور اعتدال کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اسلام کی نظر میں زندگی تعاون وہم آہنگی اور ہمدردی وموساۃ کا نام ہے۔ اسلام معاشرتی عدل کے قیام میں انہی دو بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتا ہے۔ متوازن باہم مربوط اور مکمل وحدت اور افراد اور جماعتوں کے درمیان تعاون اور دوست گیری کی روح۔ اس کے علاوہ اس عدل کے قیام میں اسلام انسانی فطرت کے بنیادی عناصر کا لحاظ بھی رکھتا ہے۔ انسان کی صلاحیتوں کو بھی پوری طرح سامنے رکھتا ہے۔

اسلام میں معاشرتی عدل کا قیام تین بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔

(۱) آزادی فکر وضمیر۔

(۲) کامل انسانی مساوات۔

(۳) اجتماعی کفالت۔

آزادئ فکر وضمیر۔

معاشرتی عدل یا کوئی بھی اجتماعی نظام اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا جب تک اس کی جڑیں فکر وشعور اور قلب وضمیر میں پیوست نہ ہو۔ انسان پر ضروریات، صلاحیتوں اور رجحانات کا جو دباؤ پڑتا ہے اس کا مقابلہ صرف قانون کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی فطری تفاوت، ذہنی اور جسمانی اختلاف کی بناء پر جمعیت بشری کو صرف عقیدے کی طاقت سے اعتدال اور توازن پر لایا جاسکتا ہے۔

---

(1) القرآن، ۲۱:۹۲

اسلام کا نقطہ نظر آغاز ہی سے انسانی فکر وشعور اور ضمیر کو غیراللہ کی عبادت اور اطاعت فرمانبرداری سے آزادکرا نا ہے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو انسان پر کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی بھی موت وزندگی، نفع ونقصان دینے والانہیں۔ آسمان وزمین میں صرف وہی ایک ذات ہے اس کے سوا سب بندے ہیں جو نہ خود اپنے لئے کچھ کرسکتے ہیں اور نہ دوسروں کیلئے۔ اللہ تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ ، وَلَمْ يُوْلَدْ o وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (1)

کہو کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

ایک الہ اور معبود ہونے کی وجہ سے اس کی عبادت بھی یکساں ہوگی، تمام انسان اس کی طرف یکساں متوجہ ہونگے۔ اس لئے کسی انسان کو دوسرے انسان پر برتری اور فوقیت حاصل نہیں ہوگی۔ فوقیت اور برتری صرف نیک عمل اور تقویٰ کی بناء پر ہوگی۔ اس لئے اسلام اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے مخلوقات کی عبادت کی اجازت نہیں دیتا یہاں تک انبیاء کرام کے بارے میں بھی فرمایا کہ یہ بھی بشر اور انسان ہیں اور ان کو الٰہی فیصلوں میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

انسانی فکروشعور اور ضمیر جب بندوں کی غلامی سے آزادہوتی ہے تو جان ومال اور عزوجاہ کے ہرقسم کے خطرات اور اندیشوں سے نجات مل جاتی ہے جو کہ انسان کی خودی کو مجروح، ذلت گوارا کرنے، بہت سے حقوق سے دست بردار ہوجانے اور بڑی حد تک اپنے عزوشرف سے ہاتھ دھونے پر آمادہ کردیتے ہیں۔ اس لئے جہاں اسلام میں قانون کے ذریعے انسان کی جان ومال کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا ہے وہاں انسان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ موت اور زندگی، عزت وذلت اور رزق کی تنگی اور کشادگی صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ بات صحیح نہیں ہوسکتی کہ موت کا خوف یا حصول معاش لوگوں کو سر جھکانے پر مجبور کردے۔ ایک کو آقا اور دوسرے کو غلام بنادے۔ جس سے معاشرہ عدم توازن کا شکار ہوجاتا ہے، انسانی معاشرہ میں عدل وانصاف مفقود ہوجاتا ہے۔ اس سے اسباب کی نفی نہیں ہوتی البتہ یہ خیال وفکر دل کو مضبوط کردیتا ہے، ضمیر کو قوت بخشتا ہے اور مفلس طالب معاش کو پوری قوت اور ہمت کے ساتھ ان سے آنکھیں چار کرنے کے قابل بناتا ہے جس کے ہاتھ میں بظاہر رزق کی کنجی ہوتی ہے۔

موت اور تنگی رزق کے خوف کے ساتھ ساتھ انسان کو مقام وعزت کا خوف بھی دامن گیر رہتا ہے۔ اسی لئے اسلام چاہتا ہے کہ فرد کو اس خوف سے بھی نجات دلائی جائے کہ اس معاملہ میں بھی کوئی بندہ کسی کا کچھ نہیں

---

(1) القرآن، ۱۱۲:۱تا۴

بگاڑ سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۔ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ(1)

کہو خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کردے۔ بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۔ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَاالَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْم بَعْدِهٖ(2)

اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں۔ اور وہ تمہیں چھوڑ دیں تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرسکتا ہے۔

خود ساختہ تقدس سے مرعوبیت یا جان و مال اور مقام و منزلت کے بارے میں اندیشوں اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی غلامانہ اور محکوم ذہنیت سے تو انسان آزاد ہوسکتا ہے لیکن ان اجتماعی قدروں اور رسوم و رواج سے چھٹکارا حاصل کرلینا کافی مشکل ہوتا ہے جو مال و دولت، جاہ و حشمت اور حسب و نسب پر مبنی ہوتی ہوں۔ خواہ انسان کو نہ فائدہ پہنچاسکتی ہوں اور نہ نقصان۔ چنانچہ جب انسان ان اقدار میں سے کسی سے مرعوب و متاثر ہو جاتا ہے تو اسی تاثیر کی حد تک اس کی آزادی بھی چھین جاتی ہے، اور جن لوگوں کو یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان کے سامنے وہ حقیقی مساوات کے شعور سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بلا افراط و تفریط ان تمام اقدار کو ان کے اس مقام پر رکھا گیا ہے جو انہیں زندگی میں واقعتاً حاصل ہونا چاہیے۔ حقیقی قدروں کو ان معنوی اور قائم بالذات، مطلق اور غیر اضافی قدروں پر پرکھا جاتا ہے جو درحقیقت انسان کے اندر اس کے ذہن کے کسی گوشے میں مستور ہوتے ہیں یا اس کے کسی عمل میں نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان مادی قدروں کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ○ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا

---

(1) القرآن، ۳:۲۶ (2) ایضاً، ۳:۱۶۰

يَعْلَمُوْنَo وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۱)

''اور انہوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال واولاد رکھتے ہیں، اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔ کہو میرا رب جس کیلئے چاہتا ہے روزی میں فراخی پیدا کرتا ہے اور جس کیلئے چاہتا ہے تنگی۔ لیکن اکثر لوگ نا سمجھ ہیں۔ تمہارے اموال والاد تمہیں اللہ سے قریب کرنے والی چیزیں نہیں۔ البتہ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجا لائے تو ایسے لوگوں کیلئے ان کے عمل کی بدولت کئی گنا اجر ہوگا اور وہ بالا خانوں میں سکون کیساتھ استراحت پذیر ہوں گے''۔

خارجی مرعوبیت ومعاشرتی رسوم ورواج سے فکری اور شعوری آزادی کیساتھ ساتھ معاشرتی عدل کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان خود اپنے نفس کی غلامی اور خواہشات سے نجات پا سکے جو کہ نوع بشر میں وجہ افتراق ہے۔ انسان جب مرغوبات اور خواہشات کا غلام بن جاتا ہے، اپنی اغراض اور ہوا کے چکر سے نہیں نکل پاتا تو خارج سے آزادی پانے کے بعد بھی داخل کے بندھنوں میں باندھا جاتا ہے اور ایسی صورت میں وہ شعور ووجدان کی اس مکمل آزادی تک نہیں پہنچ سکتا جو ہمہ گیر معاشرتی عدل کیلئے ضروری ہے۔ اسلام ہمہ گیر معاشرتی کی قیام کی خاطر انسان کے ان تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے، کوئی بھی نفسیاتی پہلو اس سے پوشیدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اے نبی کہدو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہارے بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور تمہارے وہ کاروبار جن کے مانند پڑنے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ (2)

اس قرآنی آیت میں ہر طرح کے لذائذ اور مرغوبات کا ذکر کر کے نفس انسانی کے تمام کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کردی گئی ہے تاکہ ان نفسانی لذائذ اور مرغوبات کا موزانہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور اس کی راہ میں جہاد کی تڑپ سے کیا جا سکے۔ اسکے بعد انسان قربانی اور ایثار کی تکمیل تک پہنچ سکتا ہے اور شہوات کے پھندوں

---

(1) القرآن، ۳۴: ۳۵ تا ۳۷ (2) ایضاً، ۹: ۲۴

سے مکمل آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔ اسلام کو ایسی ''نفس'' مطلوب ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ o قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (1)

لوگوں کیلئے مرغوبات نفس، عورتیں، اولاد سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہے۔ مگر یہ سب چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ اللہ کے پاس ہے۔ کہو میں تمہیں بتادوں کہ اس سے بہتر چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ان کے لئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو گی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور وہ اللہ کی رضا سے سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔

خارجی مرغوبات اور نفسانی خواہشات کے ساتھ ساتھ فقروفاقہ بھی بعض اوقات انسان کو اپنے ارفع مقام سے گرا دیتی ہے۔ انسان کبھی دست سوال دراز کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے جو کہ اس کی عزت نفس کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ اسلام میں ایک طرف قوانین بنا کر اس مسئلے کا سد باب کیا گیا ہے دوسری طرف اگر

یہ خرابی پیدا ہو جائے تو اسکے ازالے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ چنانچہ قوم کے ذی استطاعت لوگوں اور ریاست پر فرد کا حق بقدر کفالت لازم قرار دیا ہے اور اسے ایک ایسا فرض قرار دیا ہے جس کے ترک کرنے والے سے دنیا میں جنگ کی جائے گی اور آخرت میں اس کے لئے شدید عذاب ہو گا۔ اس کے علاوہ اسلام دست سوال دراز کرنے سے منع کرتا ہے چنانچہ مسلمانوں کے ایک ایسے گروہ کی تعریف کرتے ہوئے جو اللہ کی راہ کے کاموں کچھ ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ چل پھر کر روزی نہیں کماتے، فرمایا گیا ہے کہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ (2)

---

(1) القرآن، ۳:۱۴ تا ۱۵

(2) ایضاً، لایسئلون الناس الحافا (۲:۲۷۳)

نبی کریم ﷺ ایک سائل کو ایک درہم عنایت فرماتے ہیں اور پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ بات کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی رسی سنبھالے اور جا کر جلانے کی لکڑیوں کا ایک گٹھا چن کے اسے اپنی پیٹھ پر اٹھالایا اور فروخت کرے اور اس طرح اللہ اسکی آبرو سلامت رکھے، اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ کہ وہ لوگو سے مانگتا پھرے کہ لوگوں کا جی چاہے تو اسے کچھ دیدیں ورنہ نہ دیں۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (1)

مختصر یہ کہ اسلام نے معاشرتی عدل کے قیام کے سلسلے میں تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے اور اس کے ہر گوشہ کی توجہ کر کے شعور و وجدان کو ایسی آزادی کی ضمانت دیتا ہے جو صرف تصورات اور نظری قدرون پر مبنی ہے نہ اس کا واحد سہارا اقتصادی اور مادی انتظامات ہیں، بلکہ وہ بیک وقت ان دونوں بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ زندگی عملی حقائق اور نفس انسانی کی قوت برداشت دونوں کو سامنے رکھتا ہے۔ انسان کے پاکیزہ ترین رجحانات کو ابھارتا ہے۔ اس کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور قوتوں کو بیدار کرتا ہے اور بالآخر اسے وجدان و شعور کی مکمل آزادی اور بے امیز آزادی تک پہنچادیتا ہے جس کے بغیر کمزوی و کمتری اور غلامانہ ذہنیت سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی ہے اور نہ ہی معاشرتی عدل کے قیام میں کوئی قابل قدر کردار آدا کیا جا سکتا ہے۔

انسانی مساوات

جمعیت بشری میں جب فکری اور شعوری پر توازن اور اعتدال قائم ہو جا تا ہے، جب انسان کو خواہشات نفسی اور خارجی رسوم ورواج نجات سے مل جاتی ہے، انسان غربت وذلت، تکلیف ومصیبت اور موت کے اندیشوں سے یہ سمجھ کر بے نیاز ہوجاتا ہے کہ کوئی بات اذن خداوندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی، سماجی اور اقتصاوی قدروں کے دباؤ سے بھی نکل آتا ہے اور بقدر کفالت کے ضروریات زندگی بھی میسر ہوجاتا ہے تو اس وقت حقیقی مساوات قائم ہوجاتی ہے جو انسان کے رگ وپے میں سرایت کرجاتی ہے۔ اس کی پشت پر ہر فرد کو بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی قانونی ضمانت بھی حاصل ہوگی۔ اس لئے اسکے طالب وحامی صرف کمزور اور غریب لوگ نہیں ہوں گے بلکہ وہ اصحاب ثروت بھی اس کی پشت پناہی کریں گے جن کے دل اسلامی تعلیمات سے منور ہوں۔

اس آزادی ضمیر وشعور اور فکری اعتدال اور توازن کے ساتھ ساتھ اسلام نے اجتماعی عدل کے قیام کیلئے اصول مساوات کی لفظاً اور منصوص طور پر صراحت کی ہے تاکہ معاشرتی عدل میں کوئی ابہام اور تردد نہ رہے۔ دعوت اسلام سے قبل انسانیت حقیقی مساوات سے ناآشنا تھی۔ نوع بشر مختلف قسم کے لسانی، نسلی اور جغرافیائی امتیازات میں

---

(1) امام بخاری، صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب لا صدقۃ الا ظہر غنی، ص ۱۶۷۔

تقسیم تھی۔ کوئی اس بات کا دعوے دار تھا کہ وہ دیوتاؤں کی نسل سے ہے، کوئی اس زعم میں مبتلا تھا کہ اس کی رگوں میں عام لوگوں کیطرح خون نہیں بلکہ صاف، خالص اور شاہانہ خون رواں دواں ہے۔ ایک قوم انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کرکے کسی طبقہ کو خدا کے سر سے تخلیق کیے جانے کے سبب معزز اور کسی دوسرے طبقے کو خدا کے قدموں سے بنے ہونے کے سبب پست وذلیل قرار دیتی تھی۔ عورتوں اور غلاموں کو پست ترین مخلوق کہا جاتا تھا۔ عورتوں کے بارے میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ اس کے جسم میں روح بھی ہے کہ نہیں۔ آقاؤں کیلئے جائز تھا کہ وہ اپنے غلاموں کو دردناک سزائیں دیں یا قتل کرڈالے، کیونکہ وہ آقاؤں سے الگ ایک دوسرے نوع سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام نے ایک ایسے ماحول اور حالات میں مساوات کا درس دیا۔ اس نے مبداء ومعاد اور موت وزندگی میں حقوق وفرائض کے باب میں، قانون کے سامنے، اور اللہ کے حضور، دنیا اور آخرت میں، غرض ہرجگہ ہر حیثیت سے تمام انسانوں کو مساوی قرار دیا۔ بتایا کہ عمل صالح کے سوا فضیلت وامتیاز کا کوئی معیار نہیں۔

اسلام نے حسب ونسب رنگ ونسل کے بنیاد قائم امتیازات کو باطل قرار دیا اور بتایا کہ تمام انسان خلقت کے اعتبار سے اور برابر ہیں ان میں کوئی فرق نہیں۔ رنگ ونسل میں اختلاف وتنوع اور شعوب وقبائل کی تقسیم ذریعہ پہچان وتعارف اور اجتماعی زندگی کا جزء لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ (1)

کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے نہیں بنایا؟ پھر ہم نے اسے ایک جائے قرار میں ایک متعین مدت تک رکھا۔ پھر ہم نے (مزید) تعین کی اور ہم صحیح تعین کرے والے ہیں۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (2)

انسان کو چاہئے کہ وہ غور کرے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی، وہ ایک اچھلتے پانی سے بنایا گیا جو پسلیوں اور ریڑھ کی ہڈی سے نکلتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (3)

---

(1) القرآن، ۷۷: ۲۰ تا ۲۳ (2) ایضاً، ۸۶: ۵ تا ۷ (3) ایضاً، ۳۵: ۱۱

اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اور نطفہ (کے ذریعہ تخلیق کو تکمیل تک پہنچایا) پھر اس نے تم کو جوڑے جوڑے بنایا (تاکہ سلسلہ نسل آگے چل سکے) اور کوئی مادہ نہ تو اس کے علم کے بغیر حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے۔ کوئی ذی حیات نہ تو ایک خاص عمر پاتا ہے اور نہ اس کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ ساری باتیں ایک کتاب میں درج ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کیلئے آسان ہے۔

قرآن اس بات کو بار بار دہراتا ہے کہ پوری جنس انسانی مٹی سے بنایا ہے اور اور بلا استثناء ہر فرد ایک حقیر پانی سے وجود میں آیا ہے۔ ایک ہی اصل سے ہونے، ایک طرح سے پیدا ہونے اور ایک ہی طرح نشوونما پانے کی بناء پر کوئی فرد بالذات کسی دوسرے فرد سے افضل نہیں۔ اس لئے کسی قوم یا نسل کا اپنے حسب ونسب کے اعتبار سے دوسری نسلوں اور قوموں پر فضیلت کا دعویٰ بھی باطل ٹھہرا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ(1)

جو شخص نیک عمل کرے گا خواہ مرد یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔ اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے

معاشرتی زندگی سے متعلق قرآن کی ایک اصول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح تعلق اور عقیدہ و ایمان کی ظاہری صورت مخلوق خدا کے ساتھ اچھے تعلقات اور حسن سلوک ہے اس لئے ایمان اور عمل صالح آپس میں لازم وملزوم قرار دیئے گئے ہیں۔ قرآن میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر ۷۷ بار آیا ہے چالیس مرتبہ مکی سورتوں میں جبکہ ۳۷ مرتبہ مدنی سورتوں میں آیا ہے۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت غربا اور مساکین کی ضروریات کو پوری کرنا ہے۔ غریبوں کی ضروریات سے غفلت اور پہلو تہی کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ فعل ان کیلئے باعث عذاب ہے۔ قیامت کے دن جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گا کہ کس چیز نے تم کو نکر دوزخ میں ڈالے گئے ہو تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور محتاج کو کھانا نہیں کھلاتے تھے(2) معاشرتی زندگی کا ایک پہلو اپنے عزیز واقارب اور عام لوگوں کیساتھ نیکی اور خیر خواہی سے متعلق ہے۔ قرآن میں بتایا ہے گیا ہے کہ غلام کی گردن کو آزاد کرنا اور بھوک کے دن کسی یتیم اور مسکین کو کھانا کھلانا زندگی

---

(1) القرآن، ۱۶:۹۷ (2) ایضاً، ۱۰۷:۱تا۳

کی گھاٹی کو عبور کرنا ہے (1) اور یتیموں کو دھکے دینا روز جزا کو جھٹلا دینے کے مترادف ہے۔ (2) سنگ دل اور کنجوس لوگ جو محتاجوں کی حاجت روائی سے منہ موڑتے ہیں، کو قیامت کے دن سخت عذاب کی وعید آئی ہے اس دن فرشتوں کو حکم ہو گا کہ ان کو طوق ڈال کر دوزخ میں ڈال دیا جائے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے تھے (3)

اقتصادیات اجتماعی زندگی کے قیام میں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاشی انصاف اور مساوات معاشرتی عدل کیلئے بہت اہم ہے۔ معاشی ناہمواری، ارتکاز دولت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم باعث ہلاکت اور بربادی ہے عرب معاشرہ بدوی اور حضروی دو حصوں میں منقسم تھا۔ بدوی معاشرہ میں اجتماعیت، خونی رشتوں اور قبائلی شناخت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جبکہ حضروی معاشرہ جس کا اعلیٰ نمونہ مکی معاشرہ تھا، میں انفرادیت، خود پسندی، فخر اور غرور کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اسلئے مکی سورتوں میں جو آیات یتیموں اور محتاجوں کے بارے میں نازل ہوئیں ہیں وہ زیادہ تر قریش مکہ کے اس عمومی رویئے سے متعلق ہیں جو ایک تجارتی جماعت کی خصوصیت ہے۔ قبائلی مروّت کی بجائے انفرادیت کو فروغ دی جارہی تھی جو کہ تجارتی معاشرے کا بنیادی عنصر ہے۔ ظہور اسلام کے وقت مکی معاشرہ میں بنیادی تبدیلی آرہی تھی اور وہ یہ کہ پہلے یہ گلہ بان معاشرہ تھا، مال مویشی پیداواری ذرائع تھے۔ باہمی ارتباط، خونی رشتوں کی پاسداری اور انفرادیت کی بجائے اجتماعیت قبائلی زندگی اور گلہ بان معاشرہ کے عناصر ترکیبی ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مکی معاشرہ بدویت سے حضریت اور گلہ بان معاشرہ سے تجارتی معاشرہ میں تبدیل ہورہا تھا۔ تجارتی معاشرہ میں انفرادیت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ محتاجوں اور مسکینوں کی ضروریات سے پہلو تہی کی جاتی ہے۔ تجارتی مال و دولت اور سیم وزر کی کثرت سے ایک طرف خود پسندی اور تکبر جیسے معاشرتی رویئے پرورش پاتے ہیں دوسری طرف تجارتی معیشت کے خاموش شرکائے کار یعنی صارفین اور خریداروں کے ساتھ معاملات میں بددیانتی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، ناپ تول میں کمی کی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن میں شعیبؑ کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ ان کا یہ فعل فساد فی الارض قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ○ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ○ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَ هُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (4)

---

(1) القرآن، الحاقۃ، ۶۹: ۳۰ تا ۳۲ (2) ایضاً، ۱۰۷: ۱ تا ۳ (3) ایضاً، ۷۴: ۴۱ تا ۴۷

(4) ایضاً، ۲۶: ۱۸۱ تا ۱۸۳

ماپ پورا بھر دو اور نقصان دینے والے مت بنو۔ اور سیدھی ترازو سے
تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں مت گھٹاؤ اور زمین میں فساد برپا کرنے کی
کوشش مت کرو۔

ناپ تول، کیفیت وکمیت کے پیمانے اور باہمی اعتماد کے بارے میں قرآن کی اس تنبیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی نا انصافی اجتماعی ہلاکت اور تباہی کا باعث ہے۔ اسلام تجارتی انصاف اور خرید و فروخت کو تمثیلی صورت میں بیان کرکے اس کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت، خوشی اور اخروی سعادت سے تشبیہ دیتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہے : اے ایمان والو ! کیا میں تم ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچائے۔ (1)

مکی سورتوں میں قریش جس عمومی روئے پر جو تنبیہ کی گئی تھی، تنگدست افراد، یتیموں، مسکینوں کی اعانت کی تلقین کی گئی تھی، جس سے مکی معاشرہ دوطبقات امیر وغریب میں تقسیم تھا وہ بنیادی طور پر ارتکاز دولت اور ماشی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا رد تھا۔ یہ انفرادیت اور غروروخود پسندی کے جذبات اس معاشرہ سے کیلئے قطعاً ناموزوں تھے جس کا قیام اسلام کے ذریعے لانا تھا۔ اسلئے مدنی سورتوں میں صرف تنبیہ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ افراد کے درمیان موجود معاشی تفاوت اور فرق وامتیاز کا قانون کے ذریعے خاتمہ کیا۔ زکوۃ فرض کی گئی، سود کی مروجہ تمام صورتیں حرام کی گئی جس کا بنیادی مقصد یہ بتا یا گیا کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشادفرتے ہیں:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً م بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (2)

تاکہ مال تمہارے مالدار لوگوں ہی کے درمیان چکر لگاتا نہ رہ جائے۔

اس لئے مدنی معاشرہ میں معاشرتی عدل کا مفہوم معاشی ناہمواریوں، امیر وغریب کے درمیان فرق وامتیاز کا خاتمہ اورمعاشرتی وعسکری ضروریات کی تکمیل رہا۔

اجتماعی کفالت

اسلام میں معاشرتی عدل سے مراد فرداور جماعت کے درمیان اعتدال اورتوازن قائم کرنا ہے۔ اسلام انفرادی آزادی کواس کی بہترین شکل دیدتا ہے۔ ساتھ ساتھ اعلیٰ ترین معنیٰ میں انسانی مساوات برپا کرتا ہے لیکن ان دونوں کو بے لگام نہیں چھوڑتا۔ ایک طرف سماج کا مفاد اور اس کا حق ہے، دوسری طرف انسانیت کے مصالح اور

(1) القرآن، ۶۱:۱۰ (2) ایضاً، ۵۹:۷

اس کے تقاضوں کا پاس اور لحاظ ہے اور ساتھ ہی دین کے بلند تر مفاد کی قدر و قیمت بھی ہے۔ اس لئے اسلام انفرادی آزادی کی بجائے انفرادی ذمہ داری کا اصول پیش کرتا ہے اور اس کے پہلو میں اجتماعی ذمہ داری کو جگہ دیتا ہے جس کا بار فرد اور جماعت دونوں پر ہے۔ اسی ذمہ داری کو اجتماعی کفالت کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلام نے اجتماعی کفالت کا اصول پوری تفصیل کے ساتھ سامنے رکھا ہے۔ فرد اور اس کی ذات، فرد اور اس کا قریبی خاندان، فرد اور جماعت، ایک قوم اور دوسری قوموں، ایک نسل اور دوسری نسلوں سب کے کے مابین اجتماعی کفالت کا یہ اصول کارفرما ہے۔ ذمہ داریوں کا یہ اشتراک فرد اور اس کی اپنی ذات کے درمیان بھی مطلوب ہے۔ فرد اس بات کا مکلّف ہے کہ نفس کو اس کی بے لگام خوہشات سے باز رکھے۔ اسے ہر طرح کی غلاظتوں سے پاک کر کے اس کا تزکیہ کرے۔ اسے لے کر صلاح وکامیابی اور نجات کی راہ پر پیش قدمی کرے اور اسے ہلاکت میں نہ جھونک دے۔ ساتھ ہی وہ اس کا بھی مکلّف ہے کہ نفس اس حد تک اس کے مرغوبات ضرور بہم پہنچائے جہاں تک کہ اس کی فطرت پر برے اثرات پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اس کیلئے اس کی ضرورت کے مطابق آرام اور کام دونوں کے مواقع فراہم کرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰیo وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَاo فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰیo وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰیo فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی(1)

جس نے سرکشی کی روش اختیار کی اور حیات دنیا کو ترجیح دی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جو اپنے رب کے حضور حاضری سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو ہواوہوس سے باز رکھا اس کا مسکن جنت ہے۔

وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (2)

اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔

اسی طرح بتایا گیا ہے کہ نفس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور سہولت وآرام پہنچانا اس کا حق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا (3)

---

(1) القرآن، ۷۹: ۳۷ تا ۴۱ (2) ایضاً، ۲: ۱۹۵

(3) ایضاً، ۲۸: ۷۷

اللہ نے جو کچھ عطا کیا ہے اس میں اخروی زندگی کو اپنا مطمح نظر بنا اور دنیا میں اپنا حصہ نہ بھول جا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ(1)

اے آدم کے اولاد! اپنی زینتیں ہر نماز کے وقت زیر استعمال رکھو اور حد سے آگے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ انفرادی ذمہ داری اپنی جگہ مکمل ہے۔ ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ کوئی کسی کے اچھے یا برے عمل کا ذمہ دار نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ(2)

ہر فرد اپنے اعمال میں گرفتار اور مقید ہے۔

انفرادی ذمہ داری کا یہ اصول صرف شریعت محمد ﷺ کا نہیں رہا ہے بلکہ انبیائے ماضیہ کے تعلیمات کا بھی بنیادی حصہ رہا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰىo وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓىo اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰىo وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىo وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰىo ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى(3)

کیا اسے خبر نہیں ملی کہ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں کیا مذکور تھا۔ وہ ابراہیم جنھوں نے (بندگی) کا پورا حق ادا کیا۔ یہ کہ کوئی فرد کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا اور یہ انسان کے کام بس وہی ہے جس کی وہ کوشش کرے اور یہ اس کی کوششوں کا ثمرہ جلد ہی اس کے سامنے لایا جائیگا اور پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائیگا۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ(4)

ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اسی کیلئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے

---

(1) القرآن، ۷: ۳۱ (2) ایضاً، ۷۴: ۳۸

(3) ایضاً، ۵۳: ۳۶ تا ۴۱ (4) ایضاً، ۲: ۲۸۶

اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔

ان اصولوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد جو معاشرے کی بنیادی اکائی ہے توازن اور اعتدال پر آ جاتا ہے۔ اپنے نفس کا نگران بن جاتا ہے۔ انفرادی افراط وتفریط کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لغزش ہو تو اس کا محاسبہ کرتا ہے اور اگر خود غفلت برتے تو اس کا حمیازہ بھی خود ہی بھگتتا ہے۔ اس طرح فرد کو مکمل آزادی ضمیر اور کامل مساوات عطا کرنے کیساتھ ہی اسلام ہر فرد میں دو شخصیتیں پیدا کرنا چاہتا ہے جو ہمہ وقت ایک دوسرے پر نظر رکھتی ہے، اور بھلائی و برائی میں ایک دوسرے میں تعاون یا روکنے کا فرض بھی ادا کرتی ہے۔ پس اسلامی تعلیمات میں آزادی اور ذمہ داری دونوں برابر ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔

افرد اور اس کے خاندان، عزیز وآقارب، ہمسائیوں اور معاشرہ کے تمام افراد کے درمیں بھی تکافل کا اصول کارفرما ہے۔ حقوق وفرائض اور اجتماعی ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا ہے جو انسانی فطرت کے مطابق اور عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ (1)

---

(1) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا باب سوم، فصلہ دوم، ص ۱۳۴۔

مہابھارت اور رامائن میں کیا گیا ہے۔ منگنی کے تین اقسام میں سے دھرم پائن مذہبی جبکہ وٹہ سٹہ اور ٹکے دی پچار، سماجی رسوم ہیں۔

شادی سے پہلے منگنی کی رسومات ادا کی جاتی ہیں جن میں ''منگل چرن'' اور ''واک دان'' کی رسم کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ منگل چرن میں برہمن رحمت کی دعائیں مانگتا ہے جبکہ واک دان میں والدین کی طرف سے زبانی طور پر شادی کا معاہدہ طے ہو جاتا ہے جو مذہبی اور سماجی طور پر ناقابل تنسیخ ہوتا ہے۔ دوسری رسوم ''ناواں'' اور ''گراہن دینا'' کی ادائیگی بھی ضروری خیال کی جاتی ہے جن کی حیثیت مذہبی رسوم سے زیادہ سماجی رسوم کے طور پر معروف ہے۔ اس کے علاوہ منگنی کے بعد اور شادی سے پہلے جو رسوم ادا کئے جاتے ہیں ان میں تلک، چماوال یا چماوان، لگن کھولن، منکور، ہریش گدھن اور کتھا کی رسوم قابل ذکر ہیں۔ ہریش گدھن وشنو دیوتا کی علامت سمجھی جاتی ہے جو آم کی شاخ، بانس کی لکڑی اور کش کے پتوں سے بنایا جاتا ہے۔ کتھا وہ رسم ہے جس میں پروہت دلہا اور دلہن کو سامنے بٹھا کر خاندانی کہانیاں سناتا ہے اس موقع پر رام اور سیتا کا مشہور گیت بھی گایا جاتا ہے۔ (1)

شادی کے باقاعدہ رسومات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جو کم ازکم ایک ہفتے تک جاری رہتی ہیں، جن کے اہم نکات اور اصطلاحات مندرجہ ذیل ہیں:

حصہ اول

(۱) شادی ہال (پنڈال یا شادی کیلئے جو دوسری جگہ مخصوص کی جاتی ہے) کے گیٹ پر دلہا اور اس کے رشتہ داروں کا استقبال۔

(۲) سٹیج یا چبوترے پر استقبال اور تحائف کا تبادلہ۔

(۳) دلہن کے والدین کا اپنی بیٹی دلہا کو دینا یعنی کینیادان کی رسم

حصہ دوم

(۴) مقدس آگ کی رسم۔

(۵) عہد وفا اور ہاتھ ملانے کی رسم۔

(۶) پتھر پر چلنے کی رسم۔

(۷) پکے ہوئے چاول، جو کہ مقدس آگ کی رسم کے موقع پر پیش کئے جاتے ہیں۔

(۸) شادی کے بندھن کی رسم، جس میں دلہا کا سکارف دلہن کے لباس کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔

---

(1) ان رسوم کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، رامائن، ص ۴۶، ۴۷ اور گریہہ سوتر کا ادھیائے ۱، کھانڈ ۵ تا ۱۷

(۹) مقدس منتروں کا ورد کرتے ہوئے مقدس آگ کے گرد پھیرے لگانے کی رسم۔

(۱۰) سات قدم چلنے کی رسم۔

حصہ سوم

(۱۱) مقدس پانی کا چھڑکاؤ، سورج اور قطبی ستارے کی پرستش۔

(۱۲) مقدس آگ کو کھانا پیش کرنے کی رسم۔

(۱۳) اختتامی دعائیں۔

ان رسوم کے علاوہ بہت سارے علاقائی اور خاندانی رسوم بھی ہیں جو علاقائی اور خاندانی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہندومت میں شادی کی بندھن ابدی ہوتا ہے، طلاق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نکاح ثانی کا بھی تصور نہیں ہے، بیوہ ہونے پر عورت ستی ہو جاتی ہے یا پھر تمام عمر بیوگی کی زندگی گزارتی ہے۔ البتہ حصول اولاد کی خاطر بیوہ ہونے پر یا خاوند کی موجودگی میں نیوگ کی اجازت دی جاتی ہے۔

اسلام میں شادی اور اس کی رسومات

اسلام میں شادی کیلئے عربی لفظ ''نکاح'' استعمال ہوتا ہے جو لغت میں باہمی ملاپ اور یکجا ہونے کو کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ عربی مقولہ ''تناکحت الاشجار''، (1) سے ظاہر ہے۔ اصطلاح میں نکاح مرد وزن کے درمیان اس سماجی بندھن اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو ایجاب وقبول سے الفاظ سے پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔

نکاح کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فانکحوا ماطاب لکم من النساء۔ (2) یعنی جو عورتیں تم کو اچھی معلوم ہوں ان سے نکاح کرو۔ نبی کریم ﷺ نے نکاح کو اپنی سنت کہا ہے، ارشاد ہے: واتزوج النساء، فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (3) یعنی اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اب جو شخص میرے طریقے سے اعراض کرے گا وہ میرا نہیں ہے۔ نکاح اسلامی تعلیمات کے مطابق سنت رسول ﷺ ہے، جس کیلئے حق مہر اور دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے، جبکہ ایجاب کے ذریعے مرد وعورت باہمی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔ حق مہر کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی سے ادا کرو۔ (4) ایک اور آیت میں بتایا گیا ہے کہ تم اگر

---

(1) ابوالفضل, عبدالحفیظ بلیاوی, مولانا، مصباح اللغات، مادہ ''نکح'' ص ۹۰۷، مقبول اکیڈمی لاہور۔

(2) القرآن، ۴:۳

(3) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، (۴۷۷۶:۷۰)

(4) القرآن، ۴:۴

عورت کو بہت زیادہ مہر دو تو اس میں سے کچھ واپس مت لو۔ (1) نبی کریم ﷺ نے بغیر مہر کے نکاح سے منع فرمایا ہے۔ حق مہر کی مقدار کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایک شخص کا نکاح تعلیم قرآن کے عوض ہوا تھا۔ (2) قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کا نکاح لڑکی کے باپ کی معینہ مدت کی خدمت کے عوض ہوا تھا۔ (3) احادیث میں ان لوگوں کو جو خانہ داری کی طاقت نہیں رکھتے، روزہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (4)

اسلام میں بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (5) محرمات (6) اور دو بہنوں سے ایک وقت میں نکاح کی ممانعت کی گئی ہے۔ (7) اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز (8) اور مشرکین عورتوں سے ناجائز ہے۔ (9) نکاح کی صرف ایک قسم ہے جس میں عورت کا حق مہر مقرر کر کے دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کئے جاتے ہیں۔ شیعہ نکاح متعہ کے قائل ہیں جبکہ اہل سنت والجماعت کے ہاں نکاح متعہ ممنوع ہے۔ (10) اسلام میں شادی کے رسوم نہایت سادہ ہیں۔ نکاح سے پہلے لڑکے کے والدین یا سرپرست لڑکی کے والدین پاس جا کر رشتہ مانگتے ہیں، رشتہ، لڑکی کے والدین یا سرپرست، جس کو ولی کہا جاتا ہے، طے کرتا ہے۔ (11) تاہم اس موقع پر لڑکی کی رضامندی معلوم کی جاتی ہے۔ اگر ولی نکاح کر بھی لے لیکن لڑکی کی مرضی شامل نہ ہو تو وہ نکاح مردود ٹھہرایا جاتا ہے (12) نکاح سے پہلے عورت کو دیکھنے کی بھی شریعت اسلامی میں اجازت دی گئی ہے۔ (13) مقررہ وقت پر نکاح پڑھایا جاتا ہے، حق مہر مقرر کیا جاتا ہے۔ نکاح پڑھانے کی اجازت بلا امتیاز ہر مسلمان

---

(1) القرآن، ۴:۲۰

(2) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب التزویج علی القرآن وبغیر صداق (۷۰:۵۱:۴۸۵۴)

(3) القرآن، القصص، ۲۸:۲۷، ۲۸

(4) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب من لم یستطع الباۃ فلیصم، (۷۰:۳:۴۷۷۹)

(5) القرآن، ۴:۳

(6) محرمات کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سورہ نساء کی آیت ۲۳، ۲۴۔

(7) ایضاً۔

(8) ایضاً، ۵:۵

(9) ایضاً، ۲:۲۲۱

(10) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب نہی رسول اللہ ﷺ عن نکاح المتعۃ اخراً۔ (۷۰:۳۲:۴۸۲۵)

(11) ایضاً، باب لا نکاح الا بولی: (۷۰:۳۷:۴۸۳۴)

(12) ایضاً، باب اذا زوج ابنۃ وھی کارھۃ فنکاحہ مردود۔ (۷۰:۴۳:۴۸۴۵)

(13) ایضاً، باب انظر الی المرءۃ قبل التزویج، (۷۰:۳۶:۴۸۳۲)

کو دی گئی ہے، جس میں دوسری دعاؤں کے علاوہ ایجاب وقبول کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نکاح کے بعد لڑکی لڑکے کے گھر میں جاتی ہے، اس موقع پر بھی سنجیدگی اور متانت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ نکاح کے بعد ولیمہ (1) کیا جاتا ہے جس میں عزیز واقارب اور ہمسائیوں کو دعوت دے کر کھانا کھلایا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ شادی کے موقع پر تین قسم کے رسوم ادا کئے جاتے ہیں:

(i) رشتہ مانگنے کی رسم، جس میں لڑکے والدین یا سرپرست لڑکی کے والدین یا ولی سے لڑکے کیلئے رشتہ مانگتے ہیں۔

(ii) نکاح پڑھانے اور حق مہر مقرر کرنے کی رسم، جس میں دوگواہوں کے سامنے لڑکی اور لڑکے کا نکاح پڑھایا جاتا ہے، جو بنیادی طور پر ایجاب وقبول کی صورت میں ہوتا ہے۔ تاہم اس موقع پر قرآنی آیات اور دعائیہ کلمات ادا کئے جاتے ہیں۔

(iii) ولیمہ کی رسم، جس میں عزیز واقرب اور ہمسائیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان ہم آہنگی نہ ہونے کی صورت میں، جس کے اثرات معاشرتی زندگی پر بھی مرتب ہونے کا اندیشہ ہو، علیحدگی کی اجازت ہوتی ہے جس کو طلاق کہا جاتا ہے۔ بیوہ ہونے یا طلاق لینے کی صورت میں نکاح ثانی کی اجازت ہوتی ہے۔

موت کی رسومات

ہندوؤں میں موت کے رسوم کئی مراحل میں ادا کئے جاتے ہیں، جو جان لیوا بیماری اور حالت نزع سے شروع ہوکر موت کے بعد چالیسویں دن اور ہر سال برسی پر محیط ہوتے ہیں۔ حالت نزع میں جس رسم کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ گئو درشن ہے، جس میں گائے کا دیدار کرایا جاتا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس طرح مرنے والا سیدھا سورگ میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک اور رسم یہ ہے کہ حالت نزع میں مرنے والے کو چارپائی سے اتار کر دربھا گھاس پر لٹایا جاتا ہے کیونکہ چارپائی پر جان دینے والے کے بارے میں عقیدہ ہے کہ اس کی روح بدروح بن کر دوبارہ جنم لیتی ہے۔ یہ عقیدہ دراصل قدیم آریاؤں کی جنگ وجدل اور لڑائیوں سے بھرپور معاشرتی زندگی کا آئینہ دار ہے جس کے مطابق مرد کیلئے میدان جنگ کی بجائے چارپائی پر جان دینا باعث شرم سمجھا جاتا تھا۔

گریہہ سوتر کے مطابق مرنے والے کے سر کے بال، داڑھی اور جسم کے اور بال صاف کئے جاتے ہیں، ناخن کاٹ لئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد لاش کو آرتھی میں لے جا کر شمشان میں چتا جلائی جاتی ہے۔ لاش کو مادہ

---

(1) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب ولیمہ

جانور، کالی بکری وغیرہ، کو ذبح کر کے اس کے مختلف اعضاء لاش پر رکھ لئے جاتے ہیں۔

چتا کی تیاری اور اس میں لاش جلانے کی رسم:۔

چتا مستطیل شکل کا دو فٹ گہرا گھڑا کھود کر بنائی جاتی ہے جیسا کہ ویدی یا ہون کیلئے زمین میں گھڑا کھودا جاتا ہے۔ چتا جلانے کیلئے صندل کی لکڑی پاک ترین تصور کی جاتی ہے تاہم صندل کی عدم موجودگی میں پیپل، ڈھاک یا جنڈ کی لکڑی بھی استعمال ہوسکتی ہے۔ اس کا رخ شمالاً جنوباً رکھا جاتا ہے۔ جب یہ تیار ہو جائے، اور آخری پنڈ نذر کیا جائے تو جسم کے ساتھ بندھی ہوئی رسیاں کھول دی جاتی ہیں، جسم کو کمر کے بل پر لٹایا جاتا ہے، اس کے ہاتھ نچلی طرف دبائے جاتے ہیں تاکہ دوسری جنم میں یہ ظالم نہ بنے، لیکن چیچک یا دوسری متعدی بیماریوں سے مرنے والے کی لاش جلایا نہیں جاتا ہے بلکہ اس کو دریا میں پھینکا جاتا ہے۔

منہ کے قریب کفن پھاڑ کر ''پنچ رتنی'' ڈالی جاتی ہے، جبکہ صندل کی لکڑی کے کچھ ٹکڑے اور تلسی کے کچھ پتے چھاتی پر رکھ دئے جاتے ہیں۔ تب ایک آدمی ہاتھ میں جلتی ہوئی گھاس لیکر چتا کے گرد دائیں رخ ایک شکر لگا کر واپس اسی جگہ پر آجاتا ہے۔ یہاں ٹھہر کر جلتی ہوئی گھاس کو چتا پر پھینک دیتا ہے، تمام لوگ رام رام کہتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جسم کے مکمل جل جانے بعد کرمی دھرمی قریب آکر ارتھی سے ایک بانس نکال کر اس سے مردے کی کھوپری توڑ دیتا ہے، کھوپڑی تھوڑنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ انسان کی زندگی دس رعناصر پر مشتمل ہوتی ہے۔ موت آنے پر نو عناصر کا خاتمہ تو ہو جاتا ہے لیکن دسویں عنصر دھنجیے جو کی موت کے بعد تین دنوں تک فعال رہ کر جسم کے پھلنے پھولنے کا باعث ہوتا ہے، کا خاتمہ کھوپڑی تھوڑ کر کیا جاتا ہے۔ کھوپڑی بھوڑنے کے اس رسم کو ''کپال کریا'' کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے رسوم، ''کاردینا'' اور'' سوگ''ادا کئے جاتے ہیں۔ کاردینا میں لاش کے جلنے کے بعد چتا کے گرد دائرہ کھینچا جاتا ہے جبکہ سوگ مرنے والے کے تمام رشتہ دار اس کی پیروں کی طرف کھڑے ہوجاتے ہیں پھر قریب ترین رشتہ دار بلند آواز میں روتا ہے جسے ''ڈھاہ مارنا'' کہا جاتا ہے۔

تلاں جلی کی رسم:۔

''ڈھاہ'' کے بعد سب لوگ کسی دریا یا کنوئیں پر جا کر غسل کرتے اور کپڑے دھوتے ہیں۔ متوفی کے رشتہ دا اور دیگر لوگ مٹھی (چلو) میں پانی لیکر، جنوب کی طرف منہ کر کے اسے زمین پر گراتے اور ساتھ ساتھ اس کا اور اس کی گوت کا نام لیتے ہیں۔ اس پانی میں تل ملائے گئے ہوتے ہیں، اس لئے اس رسم کو ''تلاں جلی کہا جاتا ہے۔

ارتھی اور چتا کے تمام رسوم کی تکمیل اور طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے کے بعد سب لوگ متوفی کے رشتہ

داروں سے رخصت لے کر اپنے گھروں میں واپس چلے جاتے ہیں اور وہاں مکمل طہارت کی غرض سے اپنے کپڑوں پر دوبارہ پانی چھڑکا تے ہیں۔ ارتھی کی یہ تمام رسومات کی تکمیل تک گھر کے لوگوں کو کھانا کھانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد متوفی کے رشتہ دار ایک چٹائی یا دری زمین پر بچھا کر سارادن اس پر بیٹھے رہتے ہیں، سوگوار خاندان کے عزیز رشتہ دار تعزیت کیلئے آکر اس دری یا چٹائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس رسم کو ''پھوری پانا'' کہا جا تا ہے۔ عورتیں یہی رسم گھر کے اندر سرانجام دیتی ہیں۔ رات کے وقت متوفی کے زیادہ تر ہم ذات افراد اس کے گھر کے احترام میں زمین پر سوتے ہیں۔ چار دن تک روزانہ صبح سویرے خاندان کے سب افراد بلند آواز میں روتے ہیں، عورتیں بھی ان کی پیروی کرتی ہیں۔ عام طور پر مرگ والے گھر میں موت کے دن کوئی چیز نہیں پکتی ہے، گاؤں اور محلے کے دوسرے گھروں والے تیار کھانا بھیجواتے ہیں۔ موت شام یا رات کو دیر سے ہونے پر تمام رسومات اگلی صبح تک مؤخر کردی جاتی ہیں، لاش کو گھر کے اندر رکھ کر جسم جتنی لمبی ایک چھڑی رکھ دی جاتی ہے تا کہ لاش لمبی نہ ہو جائے۔

پاتک یا ناپاکی کا تصور:۔

ہندوؤں میں بچے کی پیدائش کے بعد کی'' سوتک'' ناپاکی کی طرح موت کے بعد ناپاکی کو''پاتک'' یا ''بھٹ'' کہا جاتا ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ موت کے بعد انسانی جسم ناپاک ہو جاتا ہے، اس لئے متوفی کے تمام رشتہ دار جس میں ساتویں درجے کے رشتہ دار یا بھی شامل ہوتے ہیں، ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اس ناپاکی کا عرصہ برہمنوں میں دس دن، کشتریوں میں بارہ دن، ویشوں میں پندرہ دن اور ویشوں میں ایک ماہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد تمام خاندان غسل کرکے، کپڑے دھو کر یا نئے کپڑے پہن کر گھروں پر گائے کے گوبر کا لیپ کرتے ہیں۔ ''بھٹ'' یا ناپاکی میں مبتلا شخص کو''بھٹل'' کہا جاتا ہے۔

موت کی رسومات سال بھر جاری رہتی ہیں۔ تیسرے دن پھول چننے کی رسم، (ہڈیاں اکھٹی کرکے گنگا میں پھینکنا) دسویں دن ''دسا ہی'' یعنی طہارت کی رسم، گیارویں دن ''گیارہ کی کریا''، (پنڈ کی نذر) بارویں ''دودشا''(برہمن کو دان دکشنا دینا)اور ہون کی رسم ادا جاتی ہے۔ تیرھویں دن دستار بندی کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں خاندان کے بزرگ ترین شخص کو سربراہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہانی یادگیری کی رسم جس میں برہمن کو کھانا کھلایا جا تا ہے اور سالانہ یادگیری کی رسمیں، ''برسودھی'' یا برسی، ''خیابی'' اور'' چوبرسی'' بجائی لائی جاتی ہیں۔ برسی اور چوبرسی میں ایک سیجا دان خاندان کے پروہت کو نذر کیا جا تا ہے، برہمنوں اور دوسرے غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے، لیکن خیابی میں صرف ایک برہمن یا برہمنی کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ (1)

---

(1) موت کی رسومات کی تفصیل کیلئے دیکھئے گریہہ سوتر کا دوسرا حصہ ''آسوالایانا گریہہ سوتر(Asvalayana.grihya sutra)، ادھائے ۴، کھانڈا ۸

موت کی اسلامی رسومات

اسلامی تعلیمات کے مطابق حالت نزع کی صورت میں مسلمان کا منہ داہنے کروٹ پر قبلہ کی طرف پھرادیا جاتا ہے، قریب بیٹھے ہوئے عزیز واقارب اوررشتہ دارکلمہ لا الٰہ اللہ کی تلقین کرتے ہیں۔ جب اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو میت کے ہاتھ پاؤں سیدھے کرکے اس کا منہ اور آنکھیں بند کی جاتی ہیں۔ میت کوایسے تخت پر رکھ کر جس پر تین مرتبہ کسی برتن میں آگ رکھ کر خوشبو جلائی گئی ہو، (1)اس کی کپڑے اتار کر پہلے وضو کرایا جاتا ہے اس کے بعد ایسے پانی سے غسل دی جاتی ہے جس میں بیری کے پتے یا اشنان گھاس ڈالی گئی ہو، اس خیال سے کہ اس سے لاش جلدی خراب نہیں ہوتی ہے اور جسم کا میل خوب صاف ہو جاتا ہے۔ (2)

غسل دینے کے بعد میت کو کفن پہنایا جاتا ہے جو عام طور پر تین کپڑوں یعنی آزار یا چادر جو سر سے پاؤں تک وجود کو ڈھانپ لیتا ہے، قمیص گردن سے پاؤں تک بغیر سلے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ لفافہ یا پوٹ کی چادر کو اوپر پہنایا جاتا ہے۔ عورت کیلئے کفن میں اوڑھنی اور سینہ بند کے دو کپڑے زائد ہوتے ہیں۔ کفنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پوٹ کی چادر بچھا کر دوسری چادر بچھائی جاتی ہے، مردہ کو قمیص پہنا کر پہلے دایاں پلہ لپیٹ دیا جاتا ہے پھر بایاں پلہ لپیٹ کر، آخر میں لفافہ یا پوٹ کی چادر لپیٹ دی جاتی ہے۔ میت کے بالوں اور داڑھی میں کنگھا کرنے، ناخن یا بالوں کی کاٹنے کی ممانعت ہوتی ہے۔ (3)

غسل اور کفن پہنانے کے بعد میت کو نماز جنازہ کیلئے لے جایا جاتا ہے، جو مسجد سے باہر جنازہ گاہ میں ادا کی جاتی ہے۔ (4) لغت میں جنازہ میت اور میت کے تابوت دونوں کیلئے مستعمل ہے۔ (5)

اصطلاح میں جنازہ اس حالت کو کہا جاتا ہے جب میت تخت یا پلنگ پر رکھی ہوئی ہوتی ہے، جبکہ بعض کے نزدیک جنازہ (بفتحہ جیم) میت کو اور جنازہ (جیم پر کسرہ کے ساتھ) اس تخت یا پلنگ کو کہا جاتا ہے جس پر میت کو رکھ کر لے جایا تا ہے۔ (6) نماز جنازہ کے بعد میت کو قبر میں دفنایا جاتا ہے جو لحد یا شق کی صورت میں ہوتی ہے۔ میت کو دفنانے کے بعد رشتہ دار تین دن تک سوگ مناتے ہیں جس میں میت کیلئے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ شوہر کی موت کی صورت میں بیوہ چار مہینے اور دس کی دن عدت میں گزارتی ہے۔ عدت کی مدت گزر جانے

---

(1) صبح النوری، اردو شرح مختصر القدوری، ص۱۹۲

(2) ایضاً، (3) ایضاً، ص۱۹۴

(4) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوٰۃ علی الجنائز بالمصلی والمسجد، (۲۹:۵۹:۱۲۶۳،۱۲۶۴)

(5) مصباح اللغات، ص۱۲۴

(6) صبح النوری، ص۱۹۰

کے بعد بیوہ کو نکاح ثانی کی اجازت ہوتی ہے۔ شہید کو نہ تو غسل دی جاتی ہے اور نہ کفن پہنا یا جاتا ہے، اسی کپڑوں میں نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے اور دفنا یا جاتا ہے۔ البتہ ہتھیار اور استعمال کی دوسری چیزوں کو ہٹا کر دفنا یا جاتا ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے شہدائے احد کو انہی کپڑوں میں غسل دئے بغیر کو دفن کیا جا تا ہے۔ (1)

مختصر یہ کہ موت کی اسلامی رسومات حسب ذیل ہیں:

(i) حالت نزع میں دائیں کروٹ پر لٹا کر منہ قبلے کی طرف کرنا اور کلمہ لا الہ اللہ کی تلقین کرنا۔

(ii) موت کے بعد میت کی آنکھیں اور منہ بند کرنا اور ہاتھ پاؤں کو سیدھا کرنا تا کہ میت کی صورت خوفناک اور ڈراؤنی نہ ہو جائے۔

(iii) نیم گرم پانی سے وضوء اور غسل کرا کے صفائی کرانا

(iv) مرد کو تین اور عورت کو پانچ کپڑوں کا کفن پہنانا۔

(v) عیدگاہ یا جنازہ گاہ میں نماز جنازہ پڑھانا۔

(vi) قبر کھود کر لحد یا شق میں دفن کرانا۔

(vii) عام رشتہ داروں کیلئے تین دن کا سوگ منا نا، جس میں میت کیلئے دعا ئے مغفرت کی جاتی ہے، جبکہ بیوہ کیلئے عدت کی مدت گزارنا۔ اس کے علاوہ میت کے بال، ناخن وغیرہ کے کاٹنے اور نوحہ سے منع کیا گیا ہے۔ کفن ودفن کے بعد ناپاکی کا بھی کوئی تصور نہیں ہے، بلکہ میت کو غسل دینا اور کفن پہنانا باعث اجر وثواب ہے۔ (2)

پیدائش، شادی اور موت کی رسومات کے علاوہ دوسری رسوم اور طرز زندگی جو کسی بھی معاشرہ کیلئے باعث امتیاز ہوتی ہیں، ان میں سفر وحضر، لباس، خوراک، نیک شگون اور بدشگون کیلئے ادا کی جانے والی رسوم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فن تعمیر بھی معاشرتی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہندو معاشرہ میں ان تمام رسوم کو مذہبی تقدس بھی حاصل ہے، جس کی ایک وجہ یہ تو معلوم ہوتی ہے کہ تمام تر سماجی، معاشرتی رسوم برہمنوں اور پروہتوں کی نگرانی میں ادا کی جاتی تھیں اور ان کی معاشی مفادات بھی انہی رسوم کے ساتھ وابستہ تھیں اس لئے ان تما رسوم کو مذہبی تقدس اور عبادت کا درجہ دیا جاتا تھا۔ دوسری یہ وجہ تھی کہ ہندوؤں میں تمام تر فلسفیانہ، عقلی اور سائنسی علوم کے باوجود توہمات اور جادو ٹوٹکے وغیرہ کا غلبہ رہا ہے، یجر وید میں زیادہ تر منتروں کا تعلق سحر وجادو سے ہے اس لئے ان کی معاشرتی زندگی مختلف قسم کی رسومات سے عبارت ہوتی ہے۔

ہندومت میں رسوم کا بنیادی ماٰخذ یجر وید ہے، جس میں زیادہ تر مذہبی رسوم قربانی وغیرہ پر بحث کی گئی

---

(1) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب الصلوۃ علی الشہید، باب من لم یر غسل الشہداء۔

(2) عبدالحئی، ڈاکٹر، احکام میت، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۴۵

ہے۔ اپنشدوں میں رسوم کو وسعت دے کر پیچیدہ بنائے گئے ہیں تاہم ان کا زیادہ تر تعلق مذہبی رسوم سے رہا ہے، جبکہ معاشرتی رسوم گریہہ سوتر میں تفصیل کے ساتھ بیان گئے ہیں۔ آئندہ سطور میں گریہہ سوتر میں بتائے گئے دوسری معاشرتی رسوم پر بحث کی جائی گی۔

کھانے پینے کے رسوم کا موازنہ:۔

کھانا پینا انسان کی بنیادی ضرورت کا حصہ ہے جس پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ تاریخی طور پر کھانے کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور وہ تھا جس میں انسان کچی خوراک کھاتا تھا، دوسرا دور آگ کی دریافت سے شروع ہوتا ہے جس میں خوراک کو بھون کر کھایا جاتا تھا، جبکہ تیسرے دور میں ابال کر کھانے کا رواج ہوا۔ مختلف اقوام اور اہل مذاہب میں کھانے کے مختلف طریقے رائج ہیں، حلال وحرام اور جائز وناجائز کا تصور بھی مختلف مذاہب اور قوموں میں مختلف ہے جس سے ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کا تصور نمایاں ہوتا ہے۔

ہندومت میں حلال وحرام کے تصورات، جائز وناجائز اور کھانے کے اصول وضوابط زمانے اور ورن کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

منوشاستر کے مطابق پیاز، لہسن، ناپاک جگہ اور اشیاء سے پھوٹنے والے تمام پودے، بچھڑا جننے کے فوراً بعد گاڑھا دودھ، ابالے گئے تل چاول، مکھن ملے گھیوں، میٹھا ملے دودھ، کھیر، اونٹنی کا دودھ، ایک کھر والے جانوروں کا دودھ، بھیڑ کا دودھ، گابھن ہونے کو تیار گائے کا دودھ اور ایسی گائے کا دودھ جس کا بچھڑا ساتھ نہ ہو دوجنے کیلئے ناجائز ہیں۔ اسی طرح سوائے بھینس کے تمام جنگلی جانوروں کا دودھ، عورت کا دودھ اور ایسی تمام چیزیں جو کھٹی پڑجائیں، کا کھانا بھی ممنوع ہے۔ شکاری پرندے، گاؤں کے باسی پرندے، چڑیا، ہنس، چکوا، مرغا، سارس، ہدہد، طوطا، مینا، وہ پرندے جو اپنی چونچ سے توڑ کر کھاتے ہیں، جالا نما پاؤں والے پرندے، ناخنوں سے نوچ کر کھانے والے پرندے، بگلہ اور اس نوع کے اور پرندے، کوا اور گاؤں کے پالتو سور کا کھانا بھی منع ہے۔ صرف وہ گوشت حلال ہے جس پر وید پڑھتے پانی کا چھینٹا دیا گیا ہو۔ (1) تقدیس کی بناء پر گائے کا بول پینا جائز ہے۔ اسی طرح سنیاسی اور بیوہ عورت کیلئے رات کا کھانا ممنوع ہے جبکہ بعض ہندو گائے کے گوبر سے برآمد ہونے والے غلے اور گئو موتر کے سوا کسی بھی اور چیز کے نہ کھانے کا عہد کر لیتے ہیں۔ (2)

ہندوؤں میں الگ الگ کھانے کا دستور ہے، کوئی بھی کسی دوسرا کا کھایا ہوا کھانا نہیں کھاتا، بالخصوص اونچے ذات والوں کیلئے نیچے ذات کے ساتھ کھانا کھانا یا اس کا بچا ہوا کھانا سخت مذہبی اور سماجی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ پہلے آم کے پتے پر کھانا رکھ کر کھانے کا رواج تھا اب اس کی جگہ پلیٹ نے لے لی ہے۔ مٹی کے برتن

---

(1) منوشاستر، ۵:۵تا۱۴

(2) جلال پوری, علی عباس، رسوم اقوام، ص۹۹

صرف ایک مرتبہ کھانے کیلئے استعمال کئے جاتے تھے۔

اسلام میں مردہ جانور کا گوشت، خون، خنزیر کا گوشت، غیراللہ کیلئے نامزد، گلا گھونٹ کر ہلاک کئے جانے والے، ضرب شدید سے ہلاک ہونے والے، کسی ٹکر یا تصادم سے ہلاک ہونے والے جانوروں کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔ (1) خانگی گدھوں اور درندوں کا گوشت کھانے سے بھی منع کیا گیا ہے، (2) البتہ بھوک سے لاچار یعنی اضطراری حالت میں، زندگی بچانے کیلئے حرام کھانا بھی حلال ہے۔ (3)

کھانے کی رسوم کی بنیاد طہارت، اجتماعیت، سنجیدگی، وقار اور متانت پر ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا (4)، بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرنا (5)، دائیں ہاتھ سے کھانا، (6) مل کر کھانے کی صورت میں اپنی طرف اور برتن کے کنارے سے کھانا، (7) کیونکہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔ آرام اور اطمینان کھانا، تاکہ حرص اور لالچ کا اظہار نہ ہو، کھانے کے اسلامی رسوم واداب ہیں۔ معاشرتی وحدت اور مساوات کا عکس کھانے میں بھی نمایاں ہوتا ہے جب تمام مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ الگ الگ کھانے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن مل کر کھانے کو نبی کریم ﷺ نے زیادہ پسند فرمایا ہے کہ اس میں برکت ہوتی ہے۔ (8) بلاضرورت ٹیک لگا کر کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ (9) کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے اس کے برعکس بیٹھ کر کھانے کی ترغیب دی گئی ہے کہ اس میں خاکساری کا پہلو نمایاں ہے۔ کھانے میں عیب نکالنے سے بھی منع کیا گیا ہے (10) کہ اس سے کھانے کی اور کھلانے والے کی توہین ہوتی ہے۔

پانی بیٹھ کر، ٹھہر ٹھہر کر تین سانسوں میں پینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ (11) بلاضرورت کھڑے ہوکر پانی پینے کو ناپسند کیا گیا ہے لیکن ضرورت کے وقت کھڑے ہوکر بھی پانی پینے کی اجازت دی گئی ہے۔ (12) سونے اور

---

(1) القرآن، ۵:۳

(2) صحیح البخاری، کتاب الذبائح والصید، باب لحوم الحمر الانسیۃ، (۵۲۰۲:۲۸:۷۵)

(3) القرآن، ۵:۳ (4) سنن ابوداؤد، کتاب الاطعمہ، باب غسل الید قبل الطعام (۳۶۱:۱۳۸)

(5) ایضاً، باب التسمیۃ علی الطعام (۳۶۶:۱۴۲)

(6) ایضاً، باب الاکل بالیمین (۳۷۷:۱۴۶)

(7) ایضاً، باب فی الاکل من اعلی الصحفۃ (۳۷۳:۱۴۴)

(8) سنن ابی داؤد، باب فی الاجتماع علی الطعام (۳۶۵:۱۴۱)

(9) ایضاً، باب فی الاکل متکئاً (۳۷۰:۱۴۳)

(10) ایضاً، باب فی کراہیۃ ذم الطعام (۳۶۴:۱۴۰)

(11) ایضاً، کتاب الاشربۃ، باب فی اشراب قائماً (۳۱۸: ۱۱۷)

(12) ایضاً، (۳۱۹:۱۱۷)

چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے منع کیا گیا ہے، (1) اس لئے کہ یہ بھی فخر وغرور کی علامت اور مال ودولت کا ضیاع ہے۔

لباس اور وضع قطع کی رسوم کا موزانہ:۔

انسان سب سے پہلے گرمی اور سردی سے بچنے کیلئے جانوروں کی کھالیں اوڑھ لیتا تھا جس کی یادگار اب بھی سرد علاقوں میں پوستین کی صورت میں باقی ہے۔ زرعی معاشرے میں کپاس کے پودے کی کاشت سے، جس کی ابتداء وادی سندھ سے ہوئی، (2) سوتی کپڑے پہننے کا رواج ہوا۔ چین میں ریشم کے کیڑے اور ریشمی صنعت سے ریشمی لباس تیار ہونے لگا۔ اس وقت سے آج تک لباس مختلف تہذیبوں اور معاشرت کا آئینہ دار ہے۔

ہندوؤں میں مختلف ذاتوں کی پہچان اور علامت ان کا مخصوص لباس ہوتا ہے۔ مثلاً برہمن کا چرمی لباس کالا ہرن، کھشتریہ کی سرخ ہرن اور ویش کا لباس بکرے کی کھال ہوتی ہے، جبکہ مقدس دھاگا برہمن کا سوتی، کھشتریہ کا ''سن'' اور ویش کا دھاگا اون کا ہوتا ہے۔ برہمن کا بالائی لباس سن، کھشتریہ کا ریشم جبکہ ویش کا بھیڑ کی کھال پر مشتمل ہوتا ہے۔ (3) پہلے چمڑے کے جوتوں کی بجائے لکڑی کی کھڑاؤں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جوتے عام طور پر گائے کے چمڑے سے بنتے ہیں جو کہ ہندوؤں کے ہاں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے کے تنگ دست افراد منج کی رسیوں سے بھی جوتے بناتے تھے، تاہم عصر جدید میں چمڑے کے جوتے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مختلف فرقوں کے سادھو، فقیر اور سنت، جنہیں ناگے کہا جاتا ہے، مادر زاد ننگے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندومت میں ترک مادیت کو روحانیت کی ترقی اور معراج سمجھا جاتا ہے اس لئے ہندو معاشرہ میں ان سادھوں، فقیروں اور سنتوں کی نہایت تکریم کی جاتی ہے۔

ہندومت کے مذہبی رہنماؤں میں ابتداء ہی سے سر اور داڑھی کے بالوں کو منڈوانے کا رواج رہا ہے، جو مذاہب عالم میں صرف ہندومت اور مصری پروہتوں کی خصوصیت رہی ہے۔ (4) سر کے بالوں میں ایک لٹ یا ''بودی'' چھوڑ دی جاتی ہے جس کے بارے میں عقیدہ ہے اس کے ذریعے سیدھا سورگ میں پہنچا یا جائے گا۔ اس کے علاوہ جسم کے مختلف حصوں، ماتھے وغیرہ پر ہر فرقے کی مخصوص علامت (تلک) لگانے کا مردوں اور عورتوں میں یکساں لگانے کا رواج ہے۔ ایک دوسرے سے ملتے وقت دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے یا نمسکار کہتے ہیں یا بزگوں کے پاؤں چھوکر ''پیر پوناں'' کہتے ہیں۔

---

(1) سنن ابی داؤد، کتاب الاشربہ، باب فی الشرب فی انیۃ والذہب الفضۃ (۱۲۱:۳۲۴)

(2) جلال پوری, علی عباس، رسوم اقوام، ص۱۱۶

(3) منوشاستر، ۲:۴۱، ۴۲، ۴۳

(4) علی عباس جلال پوری، رسوم اقوام، ص۱۲۴

ول ڈیورانٹ کے مطابق اٹھارویں صدی کے اواخر تک جنوبی ہند میں مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے چھاتی برہنہ کرکے چلنے کا رواج تھا۔ بچوں کو زیادہ تر دانوں اور منکوں کے ہار پہنائے جاتے تھے، بیشتر آبادی ننگے پاؤں گھومتی رہتی تھی۔ زیادہ تر مرد محض لنگی یا تہبند ہی باندھتے، دھوپ سے بچانے کیلئے سر پر پگڑی باندھنے کا بھی رواج تھا جس کا ایک سرا نیچے تک کھلا چھوڑ دیا جاتا۔ راجپوت تقریباً ہر رنگ کی پتلون نما شلوار کے ساتھ پٹی دار کوٹ، گلے میں مفلر، پاؤں میں بوٹ یا سنڈل اور سر پر مخصوص راجستھانی پگڑی باندھتے۔ (1) پیراہن، انگرکھا، ازار یا پیشواز، ساری اور لہنگا کو عورتوں کی لباس میں زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔

اسلام میں لباس اور وضع قطع اسلامی طرز معاشرت اور سوچ وفکر کی آیئنہ دار ہوتی ہے، جس کی بنیاد جسم کی حفاظت، حیا، حسن معاشرت اور عجز وانکساری پر ہے۔ لباس عربی لغت میں چھپانے اور پیوست ہو جانے کو کہتے ہیں، جیسا کہ عربی مقولہ، تلبس حبۃ بدمی (2) (اس کی محبت میرے خون میں پیوست ہوگئی ہے) سے ظاہر ہے۔ قرآن میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے (3) اور تقویٰ کو بہترین لباس قرار دیا گیا۔ (4) یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ستر پوشی انسان کی فطرت ہے اس لئے کہ آدم اور حوا علیہ السلام جب نافرمانی کی بناء پر بہشتی جوڑے سے محروم کئے گئے تو وہ اپنی برہنگی درخت کے پتوں سے چھپانے لگے۔ (5) مختصر یہ کہ اسلام میں لباس سے متعلق مندرجہ ذیل امور قابل ذکر ہیں:

(i) مردوں کو بغیر کسی مجبوری کے ریشمی لباس پہننے سے منع کیا گیا ہے۔

(ii) مردوں کو عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کو مردوں جیسا لباس اختیار کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

(iii) وہ لباس جو فخر وغرور اور بڑائی کی علامت ہو، یا جس سے ستر پوشی نہیں ہوسکتی، بھی منع کیا گیا ہے۔

مسلمانوں میں عام طور پر قمیص، شلوار، کرتہ، تہبند اور پگڑی پہننے کا رواج رہا ہے۔ مردوں کیلئے سفید لباس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ داڑھی سنت انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہے۔ ملاقات کے وقت السلام علیکم کہہ کر ہاتھ ملانے کا رواج ہے۔ چال ڈھال میں عجز وانکساری اختیار کرنے (6) اور اکھڑ کر چلنے سے منع کیا گیا ہے۔ (7)

---

(1) ول ڈیورانٹ، ہندوستان، ص ۱۲۹

(2) مصباح اللغات، ص ۷۶۴

(3) قرآنی آیت، ھن لباس لکم انتم لباس لھن، (وہ تمہاری لباس اور تم اس کا لباس ہو)

(4) ایضاً، ولباس التقویٰ ذالک خیر (۷:۲۶)

(5) القرآن، سورۂ اعراف (۷:۲۲)

(6) القرآن، الذین یمشون فی الارض ھوناً، (الفرقان، ۲۵:۶۳)

(7) ایضاً، ولاتمش فی الارض مرحا، (۳۱:۱۸)

سفر وحضر اور چند دیگر معاشرتی رسوم کا موازنہ:۔ سانکھا یانا گریہہ سوتر کے مطابق جب کوئی سفر کی نیت کرلے تو اس کو چاہیے کہ ''سما روہن'' رسم ادا کرے جس میں مقدس آگ مخصوص منتر کے ذریعے سفر پر روانہ ہونے والے شخص کے اندر داخل ہو جاتی ہے یا پھر رگ وید کے منڈل ۳، سوکت ۲۹، منتر ۱۰ کے ذریعے دو منور چھڑیوں کو گرم کرتا ہے یا پھر عام لکڑی کے ٹکڑے کو روشن کرتا ہے۔ عام آگ کو ایسی جگہ جس پر گائے کے گوبر مل گئے ہوں، جس پر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا ہو، لے کر اس کو تقدیس دی جاتی ہے۔ خلاف ورزی کی صورت میں لازم ہے کہ روزہ رکھے اور قربانی کرے۔ (1)

ہندو بحری سفر سے گریز کرتے تھے جس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا ملک ہر قسم کی خوراک اور دوسری بشری ضروریات میں خود کفیل تھا اس لئے ان کو سمندر عبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی تاہم ملک میں موجود ندی نالوں اور دریاؤں مثلاً گنگا، جمنا وغیرہ کو عبور کرنا ضروریات زندگی کا حصہ تھا۔ لہذا دریا پار کرنے کیلئے بھی مخصوص رسوم وضع کئے گئے تھے ان میں ''سواستیایانا'' رسم کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی، جس کا بنیادی مقصد خیر وعافیت سے دریا کو پار کرنا، خوش قسمتی اور ترقی کا حصول تھا۔ سواستیایانا رسم میں پانی چلو میں بھر کر تین مرتبہ دریا کے پانی میں ڈال دیا جاتا تھا اس کے بعد سمندروں، وارن اور تمام دریاؤں کی پرستش کی جاتی تھی، ساتھ ساتھ رگ وید کے مخصوص منتروں کی تلاوت بھی کی جاتی تھی۔ (2)

ہندوستان ایک زرعی ملک ہونے کی بناء پر زراعت ہی ہندوؤں کا سب سے بڑا اور بنیادی معاشی پیشہ رہا ہے اس لئے زمین میں ہل چلانے، فصل کاٹنے اور صاف کرنے کیلئے بھی مخصوص رسوم اپنائے گئے تھے۔ زمین میں ہل چلاتے وقت ''روہینی'' یا ''نکشا ترا'' رسم ادا کی جاتی تھی جس میں سب سے پہلے کھیت کے مشرقی کنارے پر ''بلی'' کی قربانی دیا جاتی تھی، جو کہ عام طور پر پکے ہوئے کھانے کی صورت میں ہوتی تھی۔ اس کے بعد مقدس منتروں کے ساتھ جنت اور زمین کی پرستش کی جاتی تھی۔ ہل چلاتے وقت برہمن ہل کو منتر پڑھتے ہوئے مس کرتا تھا، خوشحالی اور کثرت فصل کی دعا کرتا تھا۔ (3)

جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان میں گرم وسرد، خشک اور مرطوب ہر قسم کے موسم پائے جاتے ہیں، جن کے انسانی زندگی پر مفید اور مضر دونوں قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا موسمی اثرات سے بچنے کیلئے بھی مختلف قسم کے رسوم معاشرتی زندگی کا حصہ ہے، جن میں گرمی، سردی، خزاں وبہار کے برے اثرات سے بچنے کی دعا کی جاتی ہے۔ بارش، پالتو جانوروں گائے، گھوڑوں وغیرہ اور خوراک کیلئے دیوتاؤں سے دعا کی جاتی ہے۔ ان دعاؤں میں لفظ ''سواہا'' کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ (4)

---

(1) Grihya Sutra, part 1, Sankhayana Grihya Sutra, Adhyaya 5, Khanda 1.
(2) Ibid. Adhaya 4, Khanda, 14.
(3) Ibid. Khanda, 13.
(4) Ibid. Khanda,18.

جوہڑ، کنویں یا تالاب کو تقدیس دینے کیلئے منور چودھویں چاند یا پھر کسی بھی مبارک ساعت، جس کا تعین بالعموم برہمن کرتا ہے، کے موقع پر چاول کو دودھ میں پکا کر دو مخصوص منتروں کے ساتھ اس کی قربانی دی جاتی ہے۔ گھر میں رہنے والے، سفر پر جانے والے، تازی خانہ جانے والے اور اس میں رہنے والے کیلئے وارن سے دعا کی جاتی ہے، دودھ کا نذرانہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس رسم کی ادائیگی پر برہمن کو ایک جوڑا اور ایک گائے دی جاتی ہے، نیز برہمن کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔ (1)

باغ کو بھی مخصوص رسم سے تقدیس دی جاتی ہے جس کے مطابق باغ میں سب سے پہلے مقدس آگ جلائی جاتی ہے، کھانا پکایا جاتا ہے، وشنو، اندرا اور اگنی سے دعا کی جاتی ہے اور باغ کے درختوں پر رگ وید کا منڈل ۳، سوکت ۸ کا ۱۱ منتر پڑھا جاتا ہے جس کے ابتدائی الفاظ کچھ یوں ہے :اے درخت تیری ہزاروں شاخیں۔۔۔۔ (2) رسم کے آخر میں برہمن کو سونا دیا جاتا ہے۔

گھر پر فاختہ یا الو بیٹھنے کی صورت میں فاختہ کی مخصوص منتر پڑھا جاتا ہے جو رگ وید کے دسویں منڈل کا ۱۶۵ سوکت ہے۔ کوئی برا خواب یا بدشگونی کی کوئی علامت دیکھنے، یا کوے کی کائیں کائیں سننے، یا کسی بھی حیرت انگیز امر کی صورت میں ایسی گائے کا دودھ کی قربانی دی جاتی ہے جس کا ایک رنگ ہو لیکن کسی بھی صورت میں اس کا رنگ کالا نہ ہو۔ ساتھ ساتھ رگ وید کا رات کی منتر جو کہ دسویں منڈل کے ۱۲۷ سوکت کا حصہ ہے پڑھا جاتا ہے۔ برہمن کو دان دینا بھی اس رسم کا حصہ ہے۔ (3) بیماری کی صورت میں ابلے ہوئے چاول اور ''گاوادودھ کا گھاس'' کی قربانی کی رسم ادا کی جاتی ہے اور رودرا دیوتا جو کہ نہایت طاقتور اور گوندھے ہوئے بالوں والا ہے، سے دعا کی جاتی ہے۔ (4)

گھر میں اگر شہد کی مکھی چھتہ بنالے تو روزہ رکھنے اور ایک سو آٹھ لکڑی کے ٹکروں کی قربانی دیا جاتی ہے جس پر دہی، شہد اور گھی مل دیئے گئے ہوں۔ ساتھ ساتھ رگ وید کی مخصوص منتر بھی پڑھے جاتے ہیں جو کہ شہد کی مکھیوں کے کاٹنے سے بچاؤ سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ اندرا، اگنی دیوتاؤں سے خیر اور بھلائی کی دعا بھی مانگی جاتی ہے۔ (5) گھر میں چیونٹیوں کے سوراخ ہونے کی صورت میں گھر کو چھوڑ کر تین دن اور تین رات تک روزہ رکھا جاتا ہے، اس کے بعد کفارہ ادا کیا جاتا ہے۔ (6)

نئی عمارت یا گھر بنانے کے بھی مخصوص رسوم ہیں۔ سب سے پہلے گھر بنانے کیلئے مقام کا تعین کی

---

(1) Grihya Sutra, part 1, Sankhayana Grihya Sutra, Khanda, 18.
(2) Ibid. Khanda, 3.
(3) Ibid. Khanda, 5.
(4) Ibid. Khanda, 6 .
(5) Ibid. Khanda, 10.
(6) Ibid. Khanda, 11.

جاتا ہے جس میں کئی امور کو مدنظر رکھے جاتے ہیں۔ عمارت بنانے کیلئے ایسی زمین تلاش کی جاتی ہے جو مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہو:

(۱) جس پر گھاس ہو اور آبی خطرات سیلاب وغیرہ کی زد میں نہ ہو۔

(۲) پانی کا بہاؤ مشرق یا جنوب کی طرف ہو۔

(۳) جس پر ایسے درخت اگے ہو جن پر کانٹے نہ ہو اور دودھیا رس والے نہ ہو۔

(۴) سطح زمین کا برہمن کیلئے سفید، کھشتری کیلئے سرخ اور ویش کیلئے سیاہ ہونا ضروری ہے۔

(۵) زمین سخت اور ایک رنگ کی ہو، زیادہ خشک اور نمکین نہ ہو ریگستانی صحرا میں گری ہوئی نہ ہو اور نہ ہی دلدلی زمین ہو۔

(۶) جہاں پر دربھا گھاس اگتی ہو وہ زمین شان وشوکت کے خواہشمندوں کیلئے موزوں ہے، لمبی گھاس والی زمین غلبہ اور قوت کے خواہشمند افراد کیلئے، نرم گھاس والی زمین مال مویشیوں میں اضافے کیلئے مفید تصور کی جاتی ہے۔ قطعہ زمین، جس پر گھر کی عمارت تعمیر کرنی ہو، چوکور یا گول شکل میں ہونا چاہیے۔ شہرت اور طاقت کے خواہشمند افراد گھر کا دروازہ مشرق کی جانب، اولاد نرینہ اور مال مویشی کے خواہش مند افراد جنوب کی طرف اور ان تمام چیزوں کی حصول کیلئے گھر کا دروازہ شمال کی طرف رکھنا چاہیے، لیکن مغرب کی جانب کسی بھی صورت میں گھر کا دروازہ نہیں کرنا چاہیے۔ ''اسواتھا'' درخت سورج کیلئے مقدس ہے، پلاکشا درخت یاما کیلئے جبکہ نیاگرودھا اور اودمبارا درخت بالترتیب وارن اور پرجاپتی کیلئے مقدس تصور کئے جاتے ہیں اس لئے گھر کی تعمیر میں ان مخصوص اطراف کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف قربانیوں کی رسوم کی ادائیگی اور برہمنوں کو دان دکشنا دینے کی بھی ہدایت کی جاتی ہے۔ (1)

اس کے علاوہ دوسری رسوم مثلاً چاند رات کے رسوم اور کفارے کی رسوم وغیرہ بھی ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کی تشکیل میں بنیادی کردار رکھتے ہیں۔ ااس تمام رسوم کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ادائیگی کیلئے برہمن کا ہونا ضروری ہوتا ہے، جن کا معاوضہ ان کو پنچ دان کی صورت میں دیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے یہ معاشرتی رسوم دو پہلوؤں سے اہم ہیں جن کا موازنہ اسلامی رسوم سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ان میں بعض رسوم کا تعلق تو اعتقاد سے ہے جو ہندوؤں میں زیادہ تر اوہام پرستی پر مبنی ہیں، مثلاً پانی عبور کی رسم ''سواستیایانا''، زمین میں ہل چلاتے وقت 'روہینی'' یا'' نکشا ترا'' کی رسوم جن میں برہمن ہل کو مس کرتے ہوئے معاوضہ لے لیتا ہے، باغات، جوہڑوں کو تقدیس دینے کے رسوم، نیک و بدشگونی کے رسوم، فاختہ یاالو کے گھر پر بیٹھنے کے سلسلے میں ادا کی جانے والی رسومات اور چیونٹیوں کی سوراخوں کی رسوم وغیرہ۔ یہ رسوم زیادہ تر

(1) Grihya Sutra of Gobhila , Prapathaka 4 ,Khanda 7

اوہام پر مبنی ہیں، ان کا موازنہ اسلام سے قبل عربوں اور دوسری اقوام میں رائج رسوم سے کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ عربوں میں تیروں سے فال نکالنے، جنگلوں یا صحراؤں میں قیام کے دوران وہاں کی جنات سے پناہ مانگنے کے رسوم یا پھر کوے اور دوسرے پرندوں کو دیکھ کر نیک یا بدشگون خیال کرنے کے رسوم وغیرہ سے ظاہر ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے ان تمام رسوم کا خاتمہ کیا۔ اس لئے میں وہ تمام تر رسوم جو وہم پرستی کے پیداوار ہیں اور جن میں شرک کا شائبہ تک موجود ہو، اسلامی تعلیمات کی رو سے ممنوع ہیں۔ لہٰذا ہندوؤں کے ان رسوم کا اسلامی رسوم کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ یہ تمام رسوم غیر اسلامی اور عہد جاہلیت کے پیداوار تصور کئے جاتے ہیں۔

رسوم کی دوسری قسم سفر وحضر اور عمارات کی تعمیر وغیرہ سے متعلق ہے۔ سفر کے بارے میں ہندوؤں کے رسوم اوہام پرستی اور برہمن ذہن کے عکاس ہیں جبکہ اسلام نے سفر کے جو اداب ورسوم بتائے ہیں ان کا تعلق زیادہ تر حسن معاشرت سے ہے اور یہ کہ ان رسوم میں پیچدگی کی بجائے سادگی کو ترجیح دی گئی ہے۔ جیسا کہ سفر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مسافر کو خیر عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ رخصت ہونا چاہئے۔ سفر کا آغاز صبح سویرے کرنا، جماعت کے ساتھ سفر کرنا جس میں ایک امیر بھی ہو، سفر کے دوران ہم سفر ساتھی اور سواری کا خیال رکھنا، قیام راستے سے ہٹ کر کرنا وغیرہ سفر کے بارے میں اسلامی ہدایات ہیں۔ اس طرح سفر سے واپسی پر مسافر کا استقبال کرنے کے بھی اسلامی رسم موجود ہے۔ لیکن اسلام میں بتائے گئے یہ اداب ورسوم کسی مخصوص عمل کے متقاضی نہیں اور نہ ان کیلئے کسی تہوار یا تقریب کا اہتمام کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ بلکہ ان تمام رسوم واداب میں دعاؤں اور اچھے طرز عمل کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ (1)

---

(1) سفر کے اداب ورسوم کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سنن ابوداؤد کی کتاب لجہاد،

فصل پنجم

برصغیر پاک وہند کے مسلم معاشرے میں رائج ہندوانہ رسوم اور ان کا جائزہ

جہاں کہیں دو متضاد اور مختلف نظریات، تہذیبوں اور رسوم ورواج کا ملاپ ہوتا ہے وہاں اثر پذیری اور اثر انگیزی کا عمل بھی ضرور رونما ہوتا ہے اس کے علاوہ ہر انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے اباواجداد کے رسوم اور طرز زندگی کو ترک کرنا مشکل ہوتا ہے، جس کی وضاحت ان قرآنی آیات سے ہوتی ہے جن میں نبی کی تعلیمات کو قبول کرنہ نے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ لوگ اپنے اپنے اباواجدا کے طریقوں کوترک کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔(۱)

ہندوستان میں اسلامی تعلیمات نے فکری وعملی انقلاب برپا کیا، جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام کے پیروکار بن گئے۔ جولوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے ان میں بھی نمایاں فکری اور عملی تبدیلی رونما ہوئی، جس کا اظہار نانک اور کبیر جیسے ہندو مصلحین کی صورت میں ہوا، جن کی تعلیمات وافکار پر اسلام کے واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔ (2) دوسری طرف اس اختلاط کی وجہ سے مسلمانوں کے فکری، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر ہندومت کے اثرات بھی مرتب ہوئے، جوکہ لوک کہانیوں سے لے کر تکوینی نظریات تک اور معاشرتی رسوم ورواج میں برابر پائے جاتے ہیں۔ آئندہ سطور میں ہندومذہب اور معاشرے کے ان اثرات کا جائزہ لیا جائے گا جو برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی فکری، مذہبی اور سماجی زندگی پر مرتب ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد تین ادوار میں ہوئی۔ پہلے دور میں عرب مسلمان تجار ساحلی علاقوں مکران اور سراندیپ، مالدیپ اور مالابار کے جزائر میں آباد ہوئے۔ دوسرے دور میں حجاج بن یوسف کے زمانے میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے اور فتح کی صورت میں مسلمان ہندوستان آئے جبکہ تیسرے دور میں شمال کی جانب سے افغان اور ترک مغل مسلمانوں نے فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آکر سکونت اختیار کی۔ ان تینوں ادوار میں ہندو مسلم اثر انگیزی اور اثر پذیری کا عمل برابر جاری رہا۔ پہلے دور میں اگرچہ مسلمان تعداد میں کم تھے تاہم انہوں نے سادہ عقائد اور اپنے حسن معاشرت سے ہندوذہن کو زیادہ متاثر کیا، دوسرے دور میں عرب مسلمان فاتح کی حیثیت سے آئے تھے، اثر پذیری اور اثر انگیزی کا عمل اگرچہ زیادہ تیز نہیں تھا پھر بھی ہندوؤں کی عقائد اور معاشرتی زندگی اسلام سے متاثر ہوئی۔ اس دور تک مسلمانوں کی فکری اور سماجی زندگی پر ہندمی اثرات بہت کم مرتب ہوئے

---

(1) دیکھئے قرآنی آیات، یٰشعیب اصلٰوتک انترک مایعبد اباءنا، (ھود، ۱۱: ۸۷)

(2) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر تارا چند کی کتاب ''تمدن ہند پر اسلامی اثرات''

تھے۔ تیسرے دور میں جذب وانجذاب کے عمل میں تیزی آئی، مسلمانوں کے افکار واعمال اور سماجی رسوم میں ہندو عناصر کا اضافہ ہونے لگا، جس کے تین بنیادی عوامل تھے:

(i) مسلمانوں اور ہندوؤں میں فکری اور سماجی ارتباط: جس کے نتیجے میں مسلمان ہندی فلسفہ اور سماجی نظام کی جانب متوجہ ہوئے، ان کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا، ان کے عقائد رسوم ورواج پر اپنی زبان میں کتابیں لکھیں مثلاً البیرونی کی کتاب الہند وغیرہ۔ ساتھ ساتھ ان کی مذہبی کتابوں کا فارسی اور دوسری زبانوں میں ترجمے بھی کئے جن میں داراشکوہ کی اپنشدوں کے فارسی تراجم زیادہ قابل ذکر ہیں۔

(ii) فکر وعمل میں پختگی کا فقدان:

(iii) مسلم سلاطین کی سیاسی اور انتظامی مجبوریاں، جن کی بناء پر ہندوؤں کے سماجی رسوم میں امراء اور حکمران طبقہ کے افراد شرکت کرتے تھے، جس کا منطقی نتیجہ جلال الدین اکبر اعظم کے ''دین الٰہی'' کی صورت میں برآمد ہوا۔

فکری ارتباط، تصوف اور متعلقہ رسوم:۔

برصغیر ہندوپاک میں اسلام کی اشاعت، مسلم معاشرے کے قیام اور سماجی ومعاشرتی رسوم کی تشکیل میں تصوف اور صوفیائے کرام کا بنیادی کردار رہا ہے۔ معاشرے کے عام افراد کے ساتھ ساتھ امراء اور حکمران طبقے کی زندگی میں بھی تصوف اور صوفیائے کرام کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ تصوف اور صوفیائے کرام نے ایک طرف تو ہندو معاشرہ کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا، فکری اور سماجی تبدیلی لائی گئی تو دوسری طرف صوفیائے کرام کے فکری اور سماجی زندگی پر ہندومت کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ فکری اثرات تکوینی نظریات وجودیت جبکہ سماجی اثرات پیرومرید اور فقیروں کی معاشرتی رسوم کی صورت میں نمایاں ہیں۔ تصوف پر ہندومت کے اثرات کا اظہار فلسفہ وجودیت، تصور فنا فی البقاء، مذہب کے ظاہری اور خارجی رسوم کے بے معنی اور غیر اہم قرار دینے اور مراقبے کے طریقے، حبس دم اور چلہ معکوس وغیرہ میں نمایاں ہوتا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں صوفیائے کرام کی آمد ایک ایسے وقت میں ہوئی جب مسلمان سیاسی طور پر ایک بالاتر قوت کی صورت اختیار کر چکے تھے، مختلف جنگی محاذوں پر ہندوؤں کو شکست ہو چکی تھی اور ہند میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ تاہم فاتح اور مفتوح کے درمیان فکری اور سماجی خلیج موجود تھی۔ اسلامی اور مقامی فکر اور طرز معاشرت کے درمیان اولین ارتباط کا ذریعہ تصوف تھا، جس کی بنیاد سید علی بن عثمان ہجویریؒ نے ۱۰۳۹ عیسوی میں رکھی تھی۔ فکری طور پر سید علی ہجویریؒ نے شریعت وطریقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور تصوف میں ان آزاد خیال رجحانات اور وجودیت پسند ویدانتی تصورات کے خاتمے کی کوشش کی تھی جو بایزید بسطامی نے اپنے ہندی

الاصل استاد ابوعلی السندھی سے حاصل کئے تھے، (1) جس کی انتہائی صورت کی تجسیم دسویں صدی عیسوی میں حسین بن منصور حلاج کی شخصیت میں ہوئی تھی۔ اگرچہ سید علی ہجویریؒ کے فکری نظام میں شریعت وطریقت کے مابین ہم آہنگی اور راسخ الاعتقادی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود فنا کے تصور، فنون لطیفہ موسیقی وغیرہ اور مذہب کی خارجی رسم حج کے بارے میں ان کا طرز فکر راسخ الاعتقادی سے واضح انحراف اور ہندومت کے اثرات کا بین ثبوت ہیں۔ (2)

سید علی ہجویریؒ کے بعد خواجہ معین الدین چشتیؒ (۱۱۴۴ تا ۱۲۳۵) کے فکر وعمل میں یہ اثرات اور بھی نمایاں ہوتے ہیں، اس لئے کہ اس کے ہاں خدائی محبت کا جو تصور ملتا ہے اس سے وجودی فلسفے کی راہ استوار ہوتی ہے۔ وہ موسیقی کو روحانی ارتقاء کیلئے ناگزیر تصور کرتے ہیں، اس لئے مجموعی طور پر چشتی مکتبہ فکر کے دانش وروں پر ہندویت کے اثرات نمایاں طور پر ملتے ہیں، ان کے صوفیانہ عبادتوں اور ریاضتوں کے بہت سے طریقے ہندو جوگیوں سے مستعار لئے گئے تھے۔ (3) تصوف پر ہندی اثرات کا واضح اظہار بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی تعلیمات میں ہوتا ہے، جن میں ترک دنیا کی جانب رجحان اور چلہ معکوس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (4) اس کے ساتھ ساتھ سہروردیہ مکتبہ فکر، جس کی بنیاد شیخ نجیب الدین سہروردی نے رکھی تھی، نے بھی مسلم معاشرہ کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے تاہم اس پر ہندی اثرات کا سراغ بہت کم لگایا سکتا ہے۔

راسخ الاعتقادی سے کھل کر بغاوت، مذہب کے ظاہری رسوم سے انکار اور ہندومت کی طرف واضح رجحان کا اظہار تیرھویں صدی عیسوی میں ہوا، جس کی نمائندگی مجموعی طور پر شطاریہ مکتبہ فکر کے دانشور کررہے تھے۔ ہندوستان میں شطاریہ سلسلے کا آغاز شیخ عبداللہ شطاری سے ہوا، جو پیدائشی ہندوستانی نہ ہونے کے باوجود ان کی شخصیت اور تعلیمات پر ہندی فلسفے اور سریت کے نہایت گہرے اثرات موجود تھے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے وحدت الوجود کے فلسفے کا کھل اظہار کیا، جن کے مسلم معاشرہ پر نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے، ان میں عثمان مروندی المعروف لال شہباز قلندر اور شیخ شرف الدین المعروف بوعلی قلندر اپنے جوش اور ولولے کے اعتبار سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ جن کے افکار کی نشاندہی اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ سندھ کے بعض ہندو انہیں وشنو کے اوتار

---

(1) قاضی جاوید، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، نگارشات ۴- بیگم روڈ لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱

(2) موسیقی کے بارے میں آپ کا یہ قول مشہور ہے کہ ''جو شخص یہ کہے کہ مجھے خوشگوار اور نغمہ وترنم اچھے نہیں لگتے، وہ یا جھوٹ بولتا ہے یا منافق ہے یا اس شخص میں حس لطیف ہی بالکل مفقود ہے۔ ایسا آدمی اپنی بے حسی اور کورذوقی کے باعث جانوروں اور چوپایوں سے بدتر ہے۔ (برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، ص ۱۶)

(3) جاوید قاضی، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، ص ۲۱

(4) جاوید قاضی، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، ص ۲۶

بھی قرار دیتے ہیں۔ (1)

تصوف پر ہندی اثرات پیرو مرید کے درمیان ربط، مریدوں کی تربیت، آستانوں، درگاہوں کے منجاورو فقیروں کی معاشرتی زندگی اوران کے مخصوص رسوم ورواج میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی کسی کا مرید بن جاتا ہے تو پیر یا مرشد کی قدم بوسی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ (2) یہی دستور ہندومت میں زیادہ نمایاں ہے کہ جب برہمچاریہ اپنی تعلیم کا آغاز کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنے گرو کے پاؤں چھولیتا ہے۔ (3) اسی طرح پیر اپنے مرید کو مشائخ کا شجرہ یا سلسلہ نسب دیتا ہے، جو نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک بعض مرید اس کی تعویذ بنا کر پہن لیتے ہیں اور مرتے وقت یہی شجرہ ان کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے (4) مراقبہ میں دوسری رسوم کے علاوہ حبس دم اور چلہ معکوس کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جو بنیادی طور پر ہندوؤں کے جوگیوں اور سنیاسیوں کے طریقے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرتی زندگی میں یہ اثرات مزاروں، درگاہوں اور اولیاء کے قبروں پر منعقد ہونے والے تہواروں، میلوں اور عرس میں واضح نظر آتے ہیں، جن پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔

سماجی رسوم:۔

سماجی اور معاشرتی رسوم ورواج کے دو پہلوؤں پر بحث کی جاسکتی ہے۔ بعض رسوم وہ ہیں جن کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، تمام تر ہندو معاشرے سے ماخوذ ہیں اور ان کو کسی نہ کسی طرح اسلامی شکل دی گئی ہے مثلاً بسم اللہ خوانی کی رسم جس میں بچے کو پہلے بسم اللہ سکھانے کے موقع پر خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے، رقص وسرور کی محفل بھی سجائی جاتی ہے۔ دوسری قسم وہ اسلامی رسوم ہیں جن میں ہندوانہ رسوم کی امیزش کی جاتی ہے اور خالص اسلامی رسوم نہیں رہ پاتے ہیں۔ اس دوسری قسم میں کچھ رسوم تو ایسی ہیں جو اسلام کے بنیادی تعلیمات سے متصادم نہیں، جنہیں فقہ کی اصطلاح میں ''عرف'' کہا جاتا ہے۔ لیکن کچھ رسوم ایسی بھی ہیں جو کہ خالص ہندوانہ پس منظر رکھتی ہیں اور اسلام کے بنیادی نظریات سے متصادم ہوتے ہیں۔ آئندہ سطور میں مسلمانوں کی خوشی وغمی اور موت وپیدائش کی ان رسوم کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

اسلام میں پیدائش کی رسومات نومولود کے کان میں آذان دینے، نام رکھنے، تحنیک، عقیقہ اور ختنہ تک محدود ہیں ان میں کسی بھی رسم کے موقع پر مخصوص تقریب یا محفل وغیرہ کا انعقاد نہیں کیا جاتا بلکہ سادگی سے تمام رسوم ادا کئے جاتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند کے مسلم معاشرے میں پیدائش کے موقع پر مروجہ رسوم کا آغاز ہندوؤں

---

(1) جاوید قاضی، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، ص۶۰

(2) جعفر شریف، قانون اسلام، انگریزی ترجمہ جی - اے ہرکلوٹس، الا رشاد چٹرجی روڈ لاہور۱۹۷۳، ص۱۸۸

(3) منوشاستر، ۲:۷۱

(4) جعفر شریف، قانون اسلام، ص۱۸۸

کی طرح استقرار حمل سے ہوتا ہے جن میں اسقاط حمل کی خوف سے تعویذ یا مخصوص دم شدہ دھاگے کا باندھنا، ساتویں مہینے میں ''ستواہیں'' کی رسم، ''ست وانسا'' کی رسم، جس میں متعدد کنوؤں کے پانی سات یا نو گھڑے بھر کر حاملہ کو اس سے نہلا یا جاتا ہے اور نویں مہینے میں ادا کی جانے والی رسم ''نوماسا'' قابل ذکر ہیں۔ ست وانسا ''سدھر'' یعنی سات چیزوں کی رسم کو بھی اہمیت دی جاتی ہے جو ہندو رسم ہے۔ سدھر سبزیوں اور خشک میوں کی مختلف اقسام پر مشتمل سات اشیاء ہوتی ہیں جو عورت کی جھولی میں سہ پہر چار بجے ڈال دی جاتی ہیں۔ تب ایک ناریل جس ''کو جھنڈولا'' بھی کہا جاتا ہے اور جس کو ہندو مت میں مقدس تصور کیا جاتا ہے، کے دو ٹکڑے کئے جاتے ہیں۔ اگر ناریل کا گودا سفید ہو تو یہ عورت کے ہاں ''اجلا پھول'' یعنی اولاد نرینہ پیدا ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ حمل کی ان رسوم میں قدر مشترک ہے یہ کہ حاملہ عورت کو والدین کی طرف سے کھانے پینے کی اشیاء اور نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ تعویذ یا دم شدہ دھاگے باندھنے کی رسم میں دم کرنے والے کو وسائل کے مطابق فیس دی جاتی ہے جس کو ''شکرانہ'' کہا جاتا ہے۔ استقرار حمل کی یہ اور اس قسم کی دوسری رسومات کو ہندو مت میں گربھ دہان یا گربھ سنسکار کا نام دیا جاتا ہے، جبکہ اسلام میں استقرار حمل کی رسوم کا کوئی تصور نہیں ہے۔

وضع حمل اور پیدائش کی بہت سی رسومات ہندوؤں کے سماجی رسوم سے لی گئی ہیں، مثلاً درد زہ کے موقع پر ہاتھ کی شکل سے مشابہہ ''بی بی مریم کا پنجہ'' نامی پتا پانی کے گھڑے میں ڈال دیا جاتا ہے جس کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے پانی میں گھل جانے سے زچگی میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح کبھی زچگی کے موقع پر زچہ کی کمر سے تعویذ بھی باندھ دیا جاتا ہے، یا پھر اسی کمرے میں زچگی میں سہولت کی خاطر آذان دینے کی رسم بھی پائی جاتی ہے۔ وضع حمل کی یہ رسوم بھی غیر اسلامی اور ہندوؤں سے لی گئی ہیں۔

نومولود کی ولادت کے ساتھ کچھ دوسری رسوم اور ٹوٹکے بھی پائے جاتے ہیں جس سے توہماتی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً ولادت کے دوران جس بچے کے پاؤں پہلے آجاتے ہیں اس کو ''پائیل'' کہتے ہیں۔ پائیل کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے اس کی چند مرتبہ ٹانگیں چلانے سے کمر کا درد دور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ولادت کے دن ہی سے ماں کے سر کے نزدیک ایک چاقو، تلوار یا لوہے کا ایک ٹکڑا رکھا جاتا ہے تاکہ بلائیں قریب نہ آئیں، جبکہ کئی علاقوں میں یہ رسم بھی پائی جاتی ہے کہ چاقو یا تیز دار آلہ کے ساتھ کاغذ پر نظر بد اور جنات وغیرہ سے بچانے کیلئے دعائیں لکھ کر ماں کے سر کے قریب آویزاں کی جاتی ہیں۔ نظر بد اور جنات کے سایہ پڑنے سے بچانے کیلئے ایک رسم یہ بھی ہے کہ پیدائش کے بعد بچے کے گلے یا پاؤں میں مخصوص دھاگا باندھ لیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ نام رکھنے کی کئی ہندوانہ رسومات کو اسلامی شکل دی گئی ہے مثلاً اسلام میں بچے کی پیدائش کے ساتویں دن تک نام رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے تاہم اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے دور میں کسی بھی مخصوص تقریب کا سراغ نہیں ملتا۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلم معاشرے یہ دستور ہے کہ نام رکھنے کی رسم سے

قبل پہلے ماں کو اچھی خوراک نہیں دی جاتی ہے۔ نام رکھنے کی رسم کے دوران میٹھائی وغیرہ پر سورۃ فاتحہ دم کر کے بچے کی ماں اور دوسرے لوگوں کو کھلائی جاتی ہے، موسیقی کے ساتھ گانے گائے جاتے ہیں۔ نام بھی بچہ کی پیدائش کے دن اور سیاروں کی مناسبت سے رکھے جاتے ہیں۔ قرآن مجید سے فال نکال رکھنے کی رسم بھی پائی جاتی ہے مثلاً قرآن کا کوئی بھی صفحہ کھول کر حروف تہجی کی مناسبت سے نام رکھا جاتا ہے۔

عقیقہ میں سر کے تمام بالوں کو منڈوانے کی بجائے کسی پیر فقیر یا کسی بزگ کے نام پر بالوں کی لٹ ''جمال چونٹی'' چھوڑ دینے کا رواج بھی بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے (1) جو ہندوؤں کی بودی یا شکھا سے مشابہت رکھتا ہے۔ نومولود کو پہلی بار جھولے بار میں ڈالنے کی رسم بھی ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر جھولے کے پائیدان کو صندل اور سرخ دھاگوں سے آراستہ کیا جاتا ہے، مختلف قسم کے کھانے پکائے جاتے ہیں، بچے کو جھولے میں ڈالتے وقت روائتی گیت گائے جاتے ہیں۔ پیدائش کی چار مہینے کے بعد ''لڈو بانٹنے'' کی رسم ہندوؤں کی ''نش کرمن'' رسم سے مشابہ ہے۔ لڈو بانٹنے کی رسم میں لڈو تیار کر کے ان پر فاتحہ پڑھ کر تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ساتویں مہینے میں پھر پلاؤ اور کھیر پکا کر اس پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، قریبی رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی ہے، ڈھولک بجائی جاتی ہے، گیت گائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بچے کے دانت نکل آنے پر بھی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں کھانے کے مختلف اشیاء پر فاتحہ پڑھ کر دوستوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔

سالگرہ منانے کی رسم بھی ہندوؤں سے لی گئی ہے۔ اسلام کی سادہ تعلیمات میں اس قسم کی رسومات نہیں ہیں۔ زیادہ تر زور بچے کی تعلیم وتربیت اور جسمانی نشو نما پر دیا جاتا ہے، رسوم اور تقاریب کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے۔ برصغیر پاک وہند کے مسلم معاشرے میں بچے کی پہلی سالگرہ پر خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں پلاؤ اور دیگر کھانے پکائے جاتے ہیں، نبی کریم ﷺ یا نوح علیہ السلام کے نام پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ نوح علیہ السلام کے نام فاتحہ پڑھنے کی وجہ نوح علیہ السلام کی طویل عمر بتائی جاتی ہے اس لئے بچے کی سالگرہ کے موقع پر نوح علیہ السلام کے نام پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے تا کہ بچہ طویل عمر پائے۔

ختنہ خالص اسلامی رسم اور سنت ابراہیم علیہ السلام ہے۔ چونکہ ہندومت میں ختنہ نہیں ہے اس لئے اگرچہ ہندوؤں کی کوئی رسم اس سے مماثلت نہیں رکھتی تاہم برصغیر پاک وہند کے مسلم معاشرے میں یہ رسم جس طریقے سے ادا کی جاتی ہے اس میں غیر اسلامی طرز ضرور اپنایا جاتا ہے۔ مثلاً امیر گھرانوں میں یہ رواج کہ ختنہ ایک بچے کا نہیں کرایا جاتا بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بچوں، خاص طور پر پسماندہ گھرانے کے بچوں کا بھی ختنہ کرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بچہ ختنے کیلئے نہ ملے تو مٹی کا پتلا بنا کر یا کسی برتن میں پان کا بیڑا رکھ لیا جاتا ہے۔ بچے کے ختنے کے دوران مٹی کے پتلے کا علامتی ختنہ کرایا جاتا ہے یا برتن سے پان کا بیڑا اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس کو نیک

---

(1) جعفر شریف، قانون اسلام، ص ۲۱

شگون جبکہ اکیلے بچے کی ختنہ کرانے کو بدشگون تصور کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ کئی اور رسومات، مثلاً ماں کو ''تارے دکھانا'' اور ''مرگ مارنا'' وغیرہ بھی امیر طبقے میں پائی جاتی ہیں جو دراصل مغل حکمرانوں کی رسومات ہیں۔ اول الذکر میں چھٹی کی رات زچہ بچہ کو نئے کپڑے پہنا کر، ماں گھر کے صحن میں ایک سٹول پر بیٹھتی ہے، دو عورتیں اپنے ہاتھوں میں ننگی تلواروں کی نوکوں کو ملا کر ہلال بناتی ہیں تاکہ زچہ بچہ پر جنات اور پریوں کا سایہ نہ پڑ جائے۔ اس وقت ماں سر پر قرآن رکھ کر سٹول پر کھڑی ہو جاتی ہے اور بچے کو بانہوں میں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور سات ستارے گنتی ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کے بعد خیال کیا جاتا ہے کہ اس دن کے بعد آسیب اور بھوت پریت کا خطرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی دوران بچے کا باپ اپنی بیوی کے بستر پر کھڑے ہو کر بہ آواز بلند بسم اللہ پڑھتا ہے اور چھت کی طرف ایک تیر چلاتا ہے، گویا اس سے جنات اور بھوت پریت کو مار بھگاتا ہے۔ تیر چلانے کی اس رسم کو ''مرگ مارنے'' کی رسم کہا جاتا ہے۔ یہ رسم بھی وہم پرستی پر مبنی اور صابئیت یعنی ستارہ پرستی کی یادگار ہے۔ دہلی کے ایک شاعر شاہ نذیر نے بہادر شاہ ظفر کے خاندان میں ایک شہزادے کی پیدائش پر اس رسم کو یوں بیان کیا ہے:

وہیں پھر شاہ نے یہ رسم کی داں

چھپر کھٹ پر قدم رکھ، ہو کے شاداں

ادا کر حرف بسم اللہ سارا

کمان و تیر لے کر مرگ مارا

نمودار اس طرح تھا سقف میں تیر

فلک پر کہکشاں کی جیسے تحریر(1)

پیدائش کی رسومات کی طرح شادی کے رسوم درواج بھی زیادہ تر ہندوؤں سے لئے گئے ہیں، جن میں منگنی سے لے کر شادی کے زیادہ تر رسوم شامل ہیں۔ برصغیر ہندو و پاک کے مسلم معاشرے میں شادی کی مروجہ رسوم میں وٹہ سٹہ کی رسم ہندو مت سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ ہندوؤں میں دستور ہے کہ دو یا زائد خاندان آپس میں بیٹیوں کا تبادلہ کرتے ہیں، جن کی بالعموم تین صورتیں، آہموسامنا، ترپینچ تہرا لین دین اور چونچ ہیں۔ وٹہ سٹہ کی تمام صورتوں میں، ہندو رسوم کے مطابق، متعلقہ دھڑے بیک وقت مقررہ دن کو ملتے ہیں اور آپس میں لڑکیوں کا تبادلہ کر دیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس قسم کے نکاح سے منع فرمایا ہے جس میں دو افراد یا خاندان اپنی بیٹیوں کا

---

(1) بحوالہ پنجاب کے رسم ورواج کا انسائیکلو پیڈیا، ص ۶۷

تبادلہ کرتے ہیں اور حق مہر مقرر نہیں کرتے جسے اصطلاح میں نکاح ''شغار'' کہا جاتا ہے۔ (1) مسلم معاشرے میں رائج وٹہ سٹہ کی شادی ممنوعہ نکاح شغار سے قریبی مماثلت کی حامل ہے۔

کم سنی میں منگنی اور شادی کے ساتھ ساتھ قبل از پیدائش منگنی کا رواج بھی ہے جسے ''ٹھیکری کی مانگ'' کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ توقع کے مطابق لڑکی کی پیدائش پر لڑکے کی ماں اسے نہلانے کے بعد پانی میں کچھ رقم ڈال دیتی ہے یا پھر گھٹی میں شکر ملا کر دیتی ہے ؛اس طرح منگنی قرار پاتی ہے۔ شادی سے پہلے منگنی کی رسوم، جو ہندوؤں سے لئے گئے ہیں، میں پان بانٹنا، شکرانہ، پوڑیاں اور نمک چشی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کھرے (Khurray) پان بانٹنے کی رسم میں دلہے کی طرف سے چار پانچ مرد اور کچھ عورتیں پان سپاری لے کر جاتے ہیں، وہاں ''پان کا بیڑا اٹھانا' کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ ہندوؤں میں جب کوئی کسی کام کی ذمہ داری لیتا ہے تب وہ پان کا بیڑا اٹھا لیتا ہے جبکہ یہاں کے مسلمانوں میں یہ قرآن پر حلف لینے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ (2) منگنی میں پان کا بیڑے اٹھانا مرد کا عورت کی ذمہ داری قبول کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اردو زبان میں ''بیڑا اٹھانا'' کا محاورہ بھی اس سے لیا گیا ہے۔ شکرانہ کی رسم میں دلہا کے گھر والے مقررہ دن پر زیورات، انگوٹھی، چوڑیاں، کپڑے اور دوسری استعمال کی چیزیں ڈھول باجے کے ساتھ لے جاتے ہیں، دلہن کے گھر والے ان کو ''قول بیڑا'' جس میں پان اور دوسری چیزیں ہوتی ہیں، دیتے ہیں دعائے خیر کی جاتی ہے، کھانے کی اشیاء پر فاتحہ پڑھ کر تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مہندی کے رسوم میں کافی تنوع پایا جاتا ہے مختلف علاقوں میں اس کے مختلف رواج ہیں، جن میں وقت اور پیسے کا بہت زیادہ ضیاع ہو جاتا ہے، جن کا اسلامی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مہندی یا حنابندی کی رسم نہ صرف برصغیر ہندوپاک بلکہ عرب ممالک میں بھی پائی جاتی ہے مصر میں مہندی لگانے کی رات کو لیلۃ الحنا کہا جاتا ہے۔ (3)

مسلمانوں اور ہندوؤں کے موت کی رسومات میں اگرچہ بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے، جیسے تکفین وتدفین وغیرہ، تاہم مسلمانوں میں دوسری رسوم اسقات، تیسرادن، ساتواں دن، چہلم یا چالیسواں دن اور برسی وغیرہ ہندوؤں سے زیادہ مشابہہ ہیں۔ اسقات کی رسم جنازے کے بعد تدفین سے پہلے ادا کی جاتی ہے، جس میں ائمہ کرام دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک تھال میں قرآن مجید، گندم اور نقدی رکھ کر باری باری ایک دوسرے کو'' قبلت وھبت لک'' کے ساتھ دیتے ہیں اسی سات چکر پورے ہونے پر مخصوص رقم جنازے میں شریک افراد میں تقسیم کی جاتی ہے۔ تدفین کے بعد قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے کھجور یا کسی درخت کی سبز ٹہنی رکھ دی جاتی ہے۔

---

(1) صحیح البخاری، کتاب نکاح، باب الشغار (۴۸۲۲:۲۹:۷۰)

(2) جعفر شریف، قانون اسلام، ص ۶۰

(3) جلال پوری ،علی عباس ، رسوم اقوام، ص ۴۱

بعض علاقوں میں دستور ہے کہ تدفین کے بعد واپسی پر قبر سے چالیس قدم کے فاصلے پر میت کے حق میں فاتحہ پڑھی جاتی ہے، جس کو'' دائرہ کی فاتحہ'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد استطاعت کے مطابق گندم، چاؤل، نمک، روٹی مرنے کے نام ضرورت مندوں اور فقیروں میں خیرات کی جاتی ہے، نیت خیر کی فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

تدفین کے تیسرے دن قبر پر'' پھول چڑھانے کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں میت کے لواحقین کھانے کی اشیاء مثلاً موسمی پھل، پان سپاری، نان حلوہ وغیرہ اور پھولوں کی چادر لے جاتے ہیں جہاں کھانے کی اشیاء تو تقسیم کی جاتی ہیں جبکہ پھولوں کی چادر قبر پر چڑھائی جاتی ہے۔ اسی دن کسی مدرسے کے طلباء اور مساجد کے ائمہ جمع کئے جاتے ہیں جو قبر کے قریب بیٹھ کر قرآن خوانی کرتے ہیں، قبر پر خوشبو کیلئے عود اور لوبان یا اگر بتی وغیرہ جلاتے ہیں۔ دسویں دن کو'' زیارت کا دسواں'' کہا جاتا ہے جس میں دوپہر کو نان حلوہ، یا حلوہ چپاتی تیار کر کے، اس پر فاتحہ پڑھ کر پڑوسیوں میں تقسیم کا جاتا ہے، جبکہ اس سے پہلے میت کے گھر میں کسی قسم کا کھانا نہیں کھایا جاتا اور نہ ہی گھر والے گوشت یا پر لطف غذا استعمال کرتے ہیں۔ شام کو پلاؤ اور دوسرے کھانے پکا کر پڑوسیوں، حاجت مندوں اور فقیروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح تیرھویں اور بیسویں دن پر بھی کھانے پکا کر خیرات کی جاتی ہے۔ تدفین کے چالیس دن پورا ہونے پر'' چہلم'' منائی جاتی ہے جس ے بارے میں بعض توہم پرست لوگوں کا عقیدہ ہے کہ میت کی روح چالیس دن تک اس گھر میں موجود ہوتی ہے یا پھر یہ کہ چالیسویں دن اسی گھر واپس آجاتی ہے۔ بعد میں تیسرے، چھٹے، نویں اور سال پورا ہونے پر میت کے نام پر فاتحہ خوانی کی جاتی ہے، خیرات کی جاتی ہے۔ پھر ہر سال برسی منائی جاتی ہے جس میں مختلف قسم کے کھانے پکائے جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ مخصوص موقعوں مثلاً محرم الحرام کے دسویں دن اور عیدین پر میت کی ایصال ثواب کیلئے قبر پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔

ان سماجی رسوم کے علاوہ مختلف موقعوں پر تہوار منعقد کئے جاتے ہیں جن کے معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ تہوار دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو اسلامی ایام مثلاً محرم الحرام کے پہلے عشرہ اور دسویں دن، نبی کریم ﷺ کی یوم ولادت بارہ ربیع الاول اور شب برات وغیرہ، کی یاد میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ تہواروں کی دوسری قسم وہ ہے جو بزرگوں، فقیروں اور اولیائے کرام کے قبروں پر ان کی یاد میں منعقد کئے جاتے ہیں جنہیں'' عرس'' کے نام سے موسوم کئے جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں تین تہوار پائے جاتے ہیں، جن میں عید الفطر، عید الاضحیٰ اور محرم کا دسواں دن شامل ہیں۔ عیدالفطر رمضان المبارک کے اختتام پر منائی جاتی ہے، عید الاضحیٰ ذی الحجہ کی آٹھ نو اور دس تاریخ کو منائی جاتی ہے جبکہ محرم کے نویں اور دسویں دن کو مسنون روزہ رکھا جاتا ہے۔ ان تہواروں میں نماز، روزہ اور قربانی کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس قبور پر منائے جانے والے عرس عہد جاہلیت اور ہندوؤں کے سماجی رسوم سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ تہوار، جو کہ اسلامی مہینوں کے اعتبار سے منعقد کئے جاتے ہیں، محرم سے شروع ہو کر سال بھر جاری رہتے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

عاشورہ کا تہوار:۔

محرم الحرام کا پہلا عشرہ اسلام، نصرانیت اور یہودیت میں یکساں قابل احترام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہجرت مدینہ کے بعد دیکھا کہ یہود دسویں محرم کو روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ نے مسلمانوں کو دو روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ اسی دن کے مناسبت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے، نماز یعنی نوافل پڑھنے اور خیرات وصدقات کی تلقین کی گئی ہے۔ تاہم ۶۴ ہجری کو پیش آنے والے واقعہ کربلا کی وجہ تمام عالم اسلام اور ہندوستان میں یہ دن مختلف رسوم کے ساتھ منایا جاتا ہے، جن میں اگرچہ زیادہ تعداد شیعہ فرقے کی ہوتی ہے تاہم سنی بھی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ عاشورہ کی رسومات میں عاشورخانہ، تعزیہ خانہ، ذوالجناح، اورعلم کوخصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ محرم کے فقیر، جنہیں بے نوا، مجنون، ملنگ، کوے شاہ، حاجی احمق، جوگی اور بقال (1) جیسے نام رکھتے ہیں، کوخصوصی کھانا کھلایا جاتا ہے، ان کیلئے لنگر کھول دئے جاتے ہیں۔ ان فقیروں کی سماجی زندگی ہندوؤں کی جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرح ہوتی ہے۔

آخری چہارشنبہ کا تہوار:۔

یہ تہوار اسلامی مہینہ صفر کے آخری چہارشنبہ یعنی بدھ کو منایا جاتا ہے۔ اس کا پس منظر یوں بتایا جاتا ہے کہ چونکہ نبی کریم ﷺ صفر کے مہینے میں علیل ہوئے تھے اس لئے صفر کے پہلے تیرہ دن نہایت ہی برے اور بدقسمت تصور کئے جاتے ہیں۔ اسی مہینے کے انہی دنوں میں پہلے تو شادی یا مبارک کام نہیں کیا جاتا۔ لیکن کسی وجہ سے اگر شادی ہو بھی جائے تو دلہا اور دلہن کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیا جاتا، اور اس کو بدشگون تصور کیا جاتا ہے۔ اسی مہینے کی ۱۹ تاریخ کو غسل کیا جاتا ہے۔ مختلف قسم کے کھانے پکا کر دوستوں اور پڑوسیوں کو کھلائے جاتے ہیں۔ مہینے کے آخری چہارشنبہ کو خصوصی طور پر منایا جاتا ہے جس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اسی دن بیماری سے کچھ افاقہ ہوا تھا اور غسل فرمائی تھی۔ اس لئے اس دن زیادہ تر لوگ غسل کرتے ہیں صاف کپڑے پہنتے ہیں، آم یا پیپل کے پتے پر سات ''سلام'' لکھتے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل قرآنی آیات پر مشتمل ہوتے ہیں:

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (۲) سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ
(۳) سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (۴) سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ (۵)
سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ (۶) سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ

---

(1) محرم کے فقیروں کے نام، لباس اوران کی معاشرتی زندگی کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو قانون اسلام، ص۱۲۳ تا۱۴۱

(۷) سَلٰمٌ قف هِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (1)

اس کے بعد مذکورہ بالا پتے پانی سے دھوکر وہ پانی اس عقیدے کے ساتھ پیتے ہیں کہ اس طرح ہر طرح کے قسم تکالیف اور مصائب سے نجات مل جائے گی اور آرام وسکون کی زندگی بسر ہو سکے گی۔

بارہ وفات کی تقریب:۔

بارہ ربیع الاول نبی کریم ﷺ کی وفات کا دن برصغیر پاک وہند کے مسلمان خاص عقیدت واحترام سے مناتے ہیں، مساجد اور دوسرے مقامات پر اجتماعات منعقد کی جاتی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ کے فضائل ومناقب بیان کئے جاتے ہیں۔ قرآن خوانی کی جاتی ہے، پلاؤ، کھچڑی اور دوسرے کھانے پکا کر خیرات کی جاتی ہے۔ بعض لوگ جن کے پاس نبی کریم ﷺ کے پاؤں مبارک کا نقش یا دوسرے متبرکات ہوتی ہیں، اسی دن خصوصی طور پر ان کو مزین کرکے دیدار کیلئے رکھتے ہیں۔ بارہ ربیع الاول کی شب تمام رات قرآن خوانی، درود شریف اور مولود شریف پڑھنے میں گزاری جاتی ہے۔

پیر دستگیر کی گیارویں شریف:۔

سید عبدالقادر جیلانی، جنہیں پیر دستگیر، غوث اعظم، غوث الصمدانی، محبوب سبحانی جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے، کا عرس رجب الثانی کی گیارویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ سید عبدالقادر جیلانیؒ تمام مسلمانوں میں یکساں عقیدت واحترام کے لائق سمجھے جاتے ہیں، بہت سارے کرامات ان سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ دس رجب کو اس کا صندل (2) تیار کیا جاتا ہے جبکہ گیارہ رجب کو اس کا چراغاں کیا جاتا ہے۔ دس رجب کی شام کو چراغاں اور عرس کے مقام کی طرف ہر جگہ سے بڑے بڑے سبز جھنڈے، صندل، کھانے کی اشیاء مثلاً مٹھائیاں، پینجمین اور پھول وغیرہ لے کر موسیقی کے ساتھ قافلے روانہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں گیارہ تاریخ کو قرآن خوانی کی جاتی ہے، مولود شریف اور درود شریف پڑھی جاتی ہے، پیر دستگیر کے ننانوے صفاتی نام بھی گنوائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وبائی امراض ہیضہ یا طاعون کے پھیلنے کی صورت میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنے مروجہ دستور کے مطابق پیر دستگیر کے نام پر کھانے کی اشیاء پر فاتحہ پڑھ کر کھاتے ہیں یا پھر چھوٹے چھوٹے جھنڈوں پر پیر دستگیر کے نام سے فاتحہ پڑھ کر گھروں پر لہراتے ہیں تاکہ ان وبائی امراض سے محفوظ ہو سکے۔ (3) پیر دستگیر کے ساتھ ساتھ اس کے بھانجے

---

(1) قرآنی آیات، (۵۸:۳۶)(۷۹:۳۷)(۱۰۹:۳۷)(۱۲۰:۳۷)(۱۳۰:۳۷)(۷۳:۳۹)(۵:۹۷)

(2) صندل ایک خوشبودار لکڑی کا نام ہے، تاہم عام طور پر یہ لفظی معنی کی بجائے اصطلاحی معنی میں استعمال ہوتا ہے جو کہ صندل لکڑی اور دوسری خوشبودار عطریات وغیرہ کا مرکب ہوتا ہے۔ صندل مختلف تقاریب بالخصوص مذہبی تقاریب میں خوشبو کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

(3) جعفر شریف، قانون اسلام، ص۱۵۶

سید احمد کبیر رفیع کے ساتھ بھی چونکہ فقیری اور درویشی کا ایک سلسلہ وابستہ ہے، جنہیں ''فقیر رفیع'' یا ''گرزمار'' کہتے ہیں، اس لئے اس کا بھی عرس منایا جاتا ہے۔

زندہ شاہ مراد کا چراغاں اور تہوار:۔

جمادی الاول کی سترہ تاریخ کو شام کے شاہ بدیع الدین عرف زندہ شاہ مدار کا عرس منایا جاتا ہے، بعض لوگ ظاہری موت کے باوجود انہیں زندہ تصور کرتے ہیں اس لئے زندہ شاہ مدار کا نام دیا گیا ہے۔ انہوں نے دنیا کے کئی ممالک کا سفر کیا تھا، ہندوستان بھی آئے تھے اور کان پور کے قریب مکھن پور کی تعریف کی تھی جہاں اس کا مزار واقع ہے۔ سترہ جمادی الاول ان کی وفات کا دن ہے اسی دن ہر سال ان کے مزار پر میلہ لگتا ہے جہاں ملک بھر سے افراد شرکت کیلئے آتے ہیں۔ عرس کے دوران دورسوم ادا کی جاتی ہیں، جنہیں دھمال کودنا اور گائے لوٹانا کہا جاتا ہے۔ دھمال کودنے کی رسم میں کوئلے کی بڑی آگ رشن کرکے اس پر شاہ مدار کے فقیر پہلے فاتحہ پڑھتے ہیں، اس پر صندل کا چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ پھر فقیروں کا سربراہ ''دم مدار'' کا نعرہ لگا کر آگ میں کودتا ہے جبکہ دوسرے فقیر اس کی تقلید کرتے ہیں، آگ کو پاؤں سے بجھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان فقیروں کو شربت پلایا جاتا ہے، پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں اور پلاؤ کھلاتے ہیں۔ گائے لوٹانے کی رسم میں سترہ تاریخ کو ایک سیاہ گائے استانے یا گھروں میں ذبح کی جاتی ہے اس کا گوشت فقیروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر شاہ مدار کے استانے پر سیاہ علم نصب کیا جاتا ہے، شاہ مدار کے فضائل اور مناقب بیان کئے جاتے ہیں اور ان کا عرس منایا جاتا ہے۔

قادر ولی صاحب کا عرس:۔

قادر ولی، جس کو خواجہ معین الدین چشتی بھی کہتے ہیں، کا مقبرہ ناگپٹن کے قریب ناگ پور میں واقع ہے جہاں ہر سال جمادی لآخر کی گیارہ تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے۔ عرس سے چند دن پہلے ملک بھر سے ملنگ اور فقیر اکھٹے ہو جاتے ہیں، جن کے الگ الگ گروہ ہوتے ہیں ہر گروہ کے سردار کو ''سیر گروہ'' کہا جاتا ہے۔ عرس کے آغاز سے پہلے فقیروں کا احتسابی عمل ہوتا ہے، اگر کوئی فقیر ناشائستہ حرکت یا برائی کا مرتکب ہو چکا ہو تو اسے سزا دی جاتی ہے یا پھر سب کے سامنے سیر گروہ اس کا تسمہ کاٹ کر گروہ سے الگ کر دیتا ہے۔ عرس میں ''کھیر کی ہانڈی توڑنے کی رسم منائی جاتی ہے جس میں نئے چاند کے پہلے یا دوسرے دن گروہ کا سردار سیر گروہ کھیر کی ہانڈی کو توڑ دیتا ہے۔ عرس سے پہلے سیر گروہ تمام تر دنیاوی ضروریات کھانے پینے اور سونے سے بے نیاز ہو کر مراقبہ اور ذکر وفکر میں مشغول رہتا ہے۔ عرس کے دن ایک ہانڈی میں کھیر پکا کر ڈھول باجے کے ساتھ اس فقیر کے سامنے لائی جاتی ہے، فقیر اس پر فاتحہ پڑھ کر اس میں سے تھوڑا سا کھالیتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے فقیر اور قبر کے مجاور یعنی خدمت گار ہانڈی اٹھا کر دریا کے کنارے توڑ دیتے ہیں، کھیر کو متبرک سمجھ کر کھا لیتے ہیں۔ قادر ولی صاحب

کے ساتھ بھی بہت سارے کرامات منسوب کئے جاتے ہیں۔ سمندری ملاح اور جہاز راں اس کے نام کو متبرک سمجھ کر جہاز یا کشتی کے ڈوبنے کی صورت میں اس کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اسی طرح وہ تکلیف اور مصیبت سے بچ سکتے ہیں۔

ماہ رجب میں منعقد ہونے والے عرس اور تقریبات:۔

رجب کے مہینے میں تین قسم کے تہوار منائے جاتے ہیں، جن میں ایک کو ''رجب سالار کی کندوری'' دوسرے کو سید جلال الدین بخاری کا تہوار اور تیسرے تہوار کو معراج النبی ﷺ کہتے ہیں۔ رجب سالار کا تہوار مسعود گازی کی زیارت پر رجب کے کسی بھی جمعرات یا جمعہ کو منایا جاتا ہے جو کہ لکھنو کے قریب واقع ہے۔ کندوری میلے کے کئی مراحل ہیں۔ پہلے مرحلے میں اس سوراخ کو کھول دیا جاتا ہے جس کو ''علاوا'' کہتے ہیں، جس میں ہڈیاں اور پھلوں کے چھلکے اور گودے ڈال دئے جاتے ہیں۔ یہ رسم بالخصوص عورتوں میں زیادہ مقبول ہے، یہ عقیدہ بھی ہے کہ اس میں خوراک کا جو بھی حصہ دفن کیا جاتا ہے وہ آسمان پہنچ جاتا ہے۔ اسی دن مچھلی کے علاوہ مختلف قسم کے کھانے تیار کر کے خیرات کئے جاتے ہیں، خاص کر چلنے پھرنے سے معذور افراد'' کھلے گھوڑے'' کی رسم کو پاؤں کے علاج کیلئے اچھا تصور کرتے ہیں۔ انہی دنوں میں سید جلال الدین بخاری کا عرس بھی منایا جاتا ہے جس میں میٹھا پلاؤ، کھرا پلاؤ اور کھجوروں پر فاتحہ پڑھ کر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ۱۵ اور ۱۶ رجب کو واقعہ معراج نبی ﷺ کے منانے کا بھی رواج پایا جاتا ہے۔

بندہ نواز کا چراغاں اور عرس:۔

۱۶ ذیقعدہ کو بندہ نواز گیسوئے دراز، جس کو بہت بڑا ولی اور بزگ تسلیم کیا جاتا ہے، کے نام چراغاں کر کے ۱۷ ذیقعدہ کو اس کے قبر، جو گل برگاہ میں واقع ہے، پر عرس منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر قادر ولی کی عرس کی طرح فقیر کھیر کی ہانڈی توڑ دیتے ہیں، کھانے پکا کر خیرات کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ داتا گنج بخش لاہور، لال شہباز قلندر سندھ، شیخ بوعلی قلندر پانی پت، شاہ نظام لدین اولیاء دہلی، پیر بابا سوات، فرید الدین ملتان، شاہ شمس الدین دریائی لاہور شیخ بہاؤالدین زکریا ملتان وغیرہ کے قبور پر بھی ہر سال عرس منعقد کئے جاتے ہیں، جن میں زیادہ تر ہندوؤں کے رسوم ادا کئے جاتے ہیں۔ ان مذہبی تہواروں کے ساتھ ساتھ موسمی تہوار جیسے ''نوروز'' اور ''بسنت'' بھی منائے جاتے ہیں جو پارسیوں اور ہندوؤں سے لئے گئے ہیں۔

نذر و نیاز سے متعلق ہندوانہ رسوم:۔

نذر ایک قدیم رسم ہے جس میں کسی خواہش کی تکمیل کی صورت میں، جیسے بیماری سے صحت یاب ہونا،

گمشدہ چیز کی بازیابی، مال ودولت یا تجارت میں نفع، اولاد نرینہ کا پیدا ہونا وغیرہ، مخصوص کام کرنے کا پختہ عہد کیا جاتا ہے، جس کو قسم کھانا بھی کہا جاتا ہے۔ مذہبی رسم کے طور پر نذر خالص اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتا ہے، ایسے افعال واعمال جن سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً نماز، روزہ، صدقات وخیرات اور قربانی اللہ تعالیٰ کے نام پر کرنا۔ اس کے برعکس جب بھی نذر ونیاز اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کیلئے ہو جائے تو یہ مذہبی نہیں بلکہ سماجی رسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن مجید میں نذر کے بارے میں ارشاد ہے کہ عمران کی بیوی نے نذر مان لی تھی کہ اس کے پیٹ میں جو اولاد ہے وہ اللہ تعالیٰ کیلئے نذر کرے گی، جب بیٹی پیدا ہوئی اور اس کا نام مریم رکھا گیا تو اس کو زکریا علیہ السلام کے سپرد کیا۔ (1) ایک دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ لسلام کی ولادت کا وقت جب قریب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ماں حکم دیا کہ جب تو کسی انسان کو دیکھے تو کہو کہ میں نے رحمٰن کیلئے روزہ مانا ہے اور میں آج کسی بھی انسان سے بات نہیں کروں گی۔ (2) ان قرآنی آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نذر صرف اللہ تعالیٰ کیلئے جائز ہے اور نذر سے اللہ تعالیٰ کیلئے اظہار بندگی مطلوب ہوتا ہے۔

برصغیر پاک وہند کے مسلم معاشرے میں نذر ونیاز کے کئی رسوم ورواج پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کیلئے نذر کے ساتھ ساتھ انبیاء، اصحاب رسول ﷺ، پیر، فقیر اور اولیاء کے نام پر بھی نذر رکھا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ نذر عام طور پر مالی صدقات، خیرات کی صورت میں ہوتا ہے، کسی زیارت پر بھیڑ یا بکری جاتی ہے، زیارت پر چادر بچھائی جاتی ہے یا پھر غریبوں، فقیروں اور ضرورت مندوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے نذر کے طور پر پلاؤ، قورمہ اور روٹی پر فاتحہ پڑھ کر دوستوں، پڑوسیوں اور غریبوں کو کھلایا جاتا ہے۔ عورتیں شادی بیاہ یا کسی بھی مراد برآنے کی صورت میں پیر شتاب کے نام پر ''پینڈیاں'' تیار کرتی ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شادی شدہ یا بیوہ عورت کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا کر اس کو ایک سرخ دھاگہ دیا جاتا ہے جس پر نو، گیارہ یا انیس (۹، ۱۱، ۱۹) گرہیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد یہ عورت تمام پڑوسیوں کے گھروں میں خیرات مانگنے کیلئے بھیجی جاتی ہے۔ دروازے پر جا کر یہ عورت آواز لگاتی ہے کہ ''میں پیر شتاب کی گرہ کھولنے آئی ہوں'' جس پر گھر کے مکین اس کی جھولی میں چاؤل یا کچھ اناج ڈال دیتے ہیں، پھر وہ ایک گرہ کھول دیتی ہے۔ اسی طرح جب ساری گرہیں کھول جاتی ہیں اور اس کی جولی میں کافی چاؤل وغیرہ جمع ہو جاتے ہیں تو واپس گھر اس سے پینڈیاں تیار کر کے انہیں گھروں میں تقسیم کی جاتی ہے۔

بعض عورتیں کسی پیر فقیر یا بزگ کے نام پر، یہ کہہ کر کہ میں اس کو فلاں شخص یا فقیر کے نام منسوب کرتی ہوں' اپنے بچوں کی چونٹی چھوڑ دیتی ہیں۔ جب بچہ ایک خاص عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی چونٹی کاٹ دی جاتی ہے، بار بر کو اس کے وزن کے برابر سونا یا چاندی دی جاتی ہے، پلاؤ پر فاتحہ پڑھ کر تقسیم کی جاتی ہے۔ نذر کے طور پر یہ

---

(1) القرآن، ۳:۳۵، ۳۶، ۳۷ (2) ایضاً، ۱۹:۲۶

عہد بھی کیا جاتا ہے کہ میں فلاں بزگ کی زیارت کو ننگے پاؤں جاؤں گا جیسا کہ شہنشاہ اکبر نے شہزادہ سلیم کی پیدائش پر نذر مان لیا تھااور وہ ننگے پاؤں اجمیر شریف چلے گئے تھے۔بعض لوگ ہر جمعرات کو خواجہ حضر کے نام پر پھول چینی اورکھانے کے دوسری اشیاء آم یا کیلے کے پتے پر رکھ کر پانی میں بہا دیتے ہیں۔خواجہ حضر کے نام پر مخصوص مہینے میں روزہ رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔سفر میں کسی ناخوشگوار واقع سے بچنے کیلئے امام ضامن کے نام پر سکہ یا چلہ کو زرد رنگ کے کپڑے سے بازو پر باندھ لیا جاتا ہے،منزل مقصود پر پہنچنے پر اس کو اتار کر شیرینی یا پلاؤ پر فاتحہ پڑھ کر تقسیم کی جاتی ہے۔

جھاڑ پھونک، تعویذات اوردوسرے توہماتی رسوم:۔ جادوتسخیر جنات،شمن مت، فال گیری، حاضرات ارواح،غیب بینی اورنظر بد کے توہمات دنیا کے تمام اقوام میں پائے جاتے ہیں۔شہر بابل جادو کا گڑھ تھا،جس کا ذکر قرآن میں بھی ہے،(1)جہاں سے جادو کے ٹونے ٹوٹکے دنیا بھر کے علاقوں میں پھیل گئے تھے۔جادو کی دو معروف قسمیں ہیں،سفید اور کالا۔سفید جادو میں نیک ارواح سے رجوع کرکے فائدہ پہنچایا جاتا ہے جبکہ کالے جادو میں بدروحوں سے استمداد کرکے کسی کو ضرر پہنچایا جاتا ہے۔جادو کی طرح تسخیر جنات اورغیب بینی کا تصور بھی ہرجگہ پایاجاتا ہے۔تسخیر جنات کیلئے یکسوئی میں چلہ یعنی چالیس دن تک مخصوص الفاظ کا ورد کیا جاتا ہے،سلیمان علیہ السلام کا واسطہ بھی دیا جاتا ہے۔قرآن مجید کی آخری دوسورتوں یعنی معوذتین کے بارے میں آیاہے کہ نبی کریم ﷺ پر کیا گیاسحر انہی سورتوں کی بدولت اتر گیا تھا۔(2) معوذتین میں سحر،نظر بد اور تمام آفات جسمانی وروحانی کے دور کرنے کی تاثیر عظیم ہے۔(3)

برصغیر پاک وہند میں جھاڑ پھونک،تسخیر جنات،تعویذات اور غیب بینی سے متعلق رسوم ورواج پر دو پہلوؤں سے بحث کی جاسکتی ہے۔ایک پہلو کا تعلق اسلامی تعلیمات سے ہے،جس میں قرآنی آیات،اسم اعظم اور اسمائے حسنہ کا وظیفہ کرکے تسخیر جنات،نظر بد اور مختلف جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج کیا جا سکتا ہے۔مثلاً آیت فتوح(4)نماز پنجگانہ کے بعد چالیس مرتبہ چالیس دن تک مسلسل پڑھنے سے مالی مشکلات اور دوسرے مصائب ختم ہو سکتے ہیں (5)یا کسی کے گھر میں جنات ہو اور گھر کے مکینوں کو پریشان کرتے ہیں تو قرآنی آیت اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًاo وَّاَكِيْدُ كَيْدًاo فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا(6)کو تین دن تک صبح شام اکیس مرتبہ

---

(1) القرآن،۲:۱۰۲

(2) مولانا مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ج۸، ادارۃ المعارف کراچی، جنوری ۱۹۹۶،ص۸۴۶

(3) ایضاً،ص۸۴۵

(4) سورۂ انعام کی آیت نمبر۵۹(۶:۵۹)

(5) جعفر شریف، قانون اسلام،ص۲۱۴ (6) القرآن، الطارق، ۸۶: ۱۵، ۱۷

صاف پانی پر پڑھ کر فرش پر چھڑکاؤ کیا جائے تو شریر جنات کے اثرات ختم ہو سکتے ہیں (1)اسی طرح اسم اعظم اور اسمائے حسنہ کی خصوصی ورد جو کہ تربیت یافتہ اور عالم باعمل شیخ یا استاد کی نگرانی میں، مخصوص اعمال کے ساتھ مخصوص مقامات پر کی جائے تو مطلوبہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ (2)

اس کا دوسرا پہلو ان رسوم سے متعلق ہے جو توہم پرستی اور غیر اسلامی امور پر مبنی ہے، جس پر معاشرے کی اکثریت عمل پیرا ہے۔ یہ رسوم زیادہ تر ہندوؤں کے جوگیوں اور سنیاسیوں کے طرز عمل سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جادو اور ٹوٹکے ہندوؤں کے مذہبی تعلیمات کا حصہ رہے ہیں اور اتھر وید میں جادو اور حب کے منتر بیان ہوئے ہیں اس لئے یہ جوگیوں اور سنیاسیوں کے زندگی کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً بعض عورتیں ہندوؤں کے شمشان سے جلائے ہوئے مردوں کی راکھ لے کر ماتھے یا آبروؤں پر لگاتے ہیں، پھر اپنے شوہر کے سامنے جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں اس طرح شوہر کے دل میں اس کیلئے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ راکھ کیلئے ''موہنی کا کاجل'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ (3)شائد آنکھوں میں کاجل لگانے کا رواج اس سے ہی ہوا ہو۔

اس کے علاوہ مختلف قسم کے تعویذات اور پلیتہ آگ پر رکھا جاتا ہے، جس کے بارے میں یقین ہوتا ہے کہ اس سے جنات کا سایہ دور ہو جاتا ہے، کہ لکھنے کا رواج بھی مسلمانوں میں ہندوؤں سے آیا ہے۔ انہی جھاڑ پھونک سے لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت بھی پیدا کی جاتی ہے مثلاً بتایا جاتا ہے کہ اگر مطلوبہ شخص کا خاکہ زمین یا کچے اینٹ پر بنا یا جائے اور اس پر یہ الفاظ: **یا قاھر ذا لبصس الشدید انت الذی لا یطاق انتقامہٗ** روزانہ دوپہر کے وقت ایک ہفتہ تک پانچ سو مرتبہ پڑھ کر دم کیا جائے تو اس سے مطلوبہ شخص کی موت واقع ہوگی۔ (4)ایک ٹوٹکہ یہ بھی ہے کہ قبر یا ہندوؤں کے شمشان سے مٹی لے کر اس سے مطلوبہ شخص کا پتلا بنایا جاتا ہے جس پر مخصوص کلمات کا وظیفہ پڑھا جاتا ہے، پھر اس پتلے کے مختلف اعضاء میں درخت کے کانٹے اس یقین کے ساتھ چھبو دئے جاتے ہیں کہ اس سے مطلوبہ فرد کی موت واقع ہو جائے۔(5)

---

(1) جعفر شریف، قانون اسلام، ص۲۲۵

(2) تسخیر جنات اور جھاڑ پھونک کی دوسری رسوم کی تفصیل کیلئے دیکھئے، قانون اسلام، باب نمبر۲۹، ص۲۰۱ تا ۲۲۳

(3) جعفر شریف، قانون اسلام، ص۲۲۷

(4) ایضاً، ص۲۳۰

(5) ایضاً، ص۲۳۰

باب ششم

خلاصہ بحث اور نتائج

(i) علم بشریات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان نے جب سے تمدنی اور اجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک انسانی معاشروں کی تشکیل میں دوسرے عوامل، جغرافیائی اور گردپیش کے حالات کے ساتھ ساتھ مذہب کا بنیادی کردار رہا ہے۔ اس کا ثبوت مذہبی نوشتوں اور علم آثار قدیمہ سے یکساں طور پر ملتا ہے۔ دجلہ وفرات کی وادیوں، ہڑپہ اور موہنجوداڑوں، اسٹریلیا اور الجزائر کے وحشی قبائل اور مصر کے قدیم ترین آثار کی جدید تحقیقات سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ عمرانیات بشری کی بنیاد مذہب اور ایک الٰہ کے تصور پر رکھا گیا ہے۔ (1) ور یہ کہ تمام تر انسانی معاشرے یعنی شکار گیر معاشرہ، گلہ بان معاشرہ، ماہی گیر معاشرہ، زرعی معاشرہ اور صنعتی معاشرہ کے اجزئے ترکیبی میں مذہب اور تصور الٰہ ایک بنیادی عنصر رہا ہے۔ صنعتی معاشرہ کے سیاسی اور معاشی اصولوں کی ترکیب میں اگرچہ مذہب کا کردار کم ہے تاہم اس کو سماجی اور معاشرتی زندگی کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے۔

(ii) مذاہب عالم میں اسلام عالمگیر اور آفاقی مذہب ہے۔ اس کی تعلیمات فرد اور معاشرے کی پوری زندگی پر حاوی ہیں اور انسان کو ہر معاملے اور مسئلے میں اس سے رہنمائی مل جاتی ہے، جبکہ دوسرے مذاہب زمان ومکان اور انسان کی نجی زندگی تک محدود ہوتے ہیں، فرد ومعاشرے کو مخصوص عبادات اور چند اخلاقی اقدار کا پابند بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نسلی لسانی، علاقائی اور جغرافیائی تصورات سے بالاتر ایک ایسے معاشرے کا قیام جس کے اجزائے ترکیبی میں بنیادی اور نمایاں عنصر مذہب ہو، اسلام کی بناء پر عمل میں لایا گیا، جس کو ''اسلامی معاشرہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ تاریخ بشری میں اس قسم کے معاشرے کا سراغ کہیں بھی نہیں ملتا جس کا قیام نسلی، لسانی اور جغرفیائی تصورات سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف مذہب کی بنیاد پر ہو۔ یہ درست ہے کہ مذہب ان تمام معاشروں کا ایک لازمی جز رہا ہے تاہم اس کے اجزائے ترکیبی میں مذہب کے ساتھ ساتھ دوسرے تصورات، مثلاً قومی، قبائلی اور خاندانی ونسلی تصورات وغیرہ بھی اہمیت کے حامل رہے ہیں، جبکہ اسلامی معاشرے میں نسبی اور خاندانی رشتوں سے بالاتر اسلامی بھائی چارے کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے جس کی مثال مدینہ میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے قائم کردہ معاشرے سے دی جاسکتی ہے جس کی بنیاد صرف اور صرف اسلام پر رکھی گئی تھی۔ مذہب اسلام کی معاشرتی انضمام اور جمعیت

---

(1) آزاد، ابوالکلام، مولانا، ترجمان القرآن، ص ۱۶۵ تا ۱۶۹

بشری کے مابین بھائی چارے اور ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے مطالعہ اسلام کی ضرورت کے بارے میں منٹگمری واٹ لکھتے ہیں:

''اسلام کی دوسری اوصاف کے ساتھ ساتھ یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ مختلف لوگوں اور قوموں نے اسلام قبول کیا ہے اور ان کے درمیان بھائی چارے اور ہم آہنگی کا مضبوط احساس پایا جاتا ہے۔ اسلام کی اس خوبی کا کسی بھی دوسرے مذہب یا سماجی نظام سے موزنہ نہیں کیا جا سکتا ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی میں عیسائیت کی فرغ اور پھیل جانے میں کسی حد تک یہ خوبی پائی جاتی ہے جو کہ اسلام کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اسی ایک دنیا میں جبکہ بنی نوع انسان جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب آچکے ہیں، لیکن اس میں بھائی چارے اور ہم آہنگی کا سخت فقدان پایا جاتا ہے۔ مطالعہ اسلام سے شائد دنیا کے معاشروں کے انضمام اور اس کے طریقہ کار پر کچھ روشنی ڈالا جا سکے اور شائد اس سے یہ راہنمائی بھی مل سکے کہ انسان کس طرح شعوری پر، اس طریقہ کار میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے''۔ (1)

اسلام کے وہ بنیادی اصول جو بشری معاشروں کے انضمام اور معاشرتی شیرازہ بندی کیلئے وضع کئے گئے ہیں، جن پر اسلامی معاشرہ کی عمارت استوار کی جاتی ہے، حسب ذیل ہیں:

پہلا اصول۔ دینی وحدت:۔

اسلام سے قبل اور عصر جدید میں بھی نوع بشر فکری اور مذہبی اختلافات اور کشمکش کا شکار رہا ہے۔ اسلام نے تمام بنی آدم کو ایک دین اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی ہے۔ اسلام سے قبل مختلف انبیاء علیھم السلام مختلف قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ نبی کی کی بعثت، اس کا پیغام ہدایت کسی خاص قوم کیلئے نہیں بلکہ تمام انسانیت کیلئے تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (2)

اے نبی کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں سارے انسانوں کیلئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

---

(1) Watt, M.W. Islam and The Integration of Society. P. 1.

(2) القرآن، ۷:۱۵۸

ایک اور جگہ آیا ہے کہ ہم نے تجھے تمام نوع انسانی کیلئے بھیجا ہے۔ (1) نبی کریم ﷺ بھی اس سلسلے میں ارشاد فرما ہیں کہ مجھے چھ باتوں کی وجہ دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ مجھ سے پہلے نبی صرف اپنی قوم کیلئے بھیجے گئے لیکن میں تمام لوگوں کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا ہوں۔ (2)انسانی تفرقہ، قومی اور لسانی امتیاز کے خاتمے اور نوع بشر کی معاشرتی شیرازہ بندی کیلئے قرآن مجید نے تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا لازمی قرار دیا ہے۔ (3)اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں۔ ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں اور اللہ نے ان کیلئے ذلیل وخوار کرنے والا عذاب تیار کررکھا ہے۔ (4)

دوسرا اصول۔نسلی وحدت:۔

اسلام نے تمام نسل انسانی کی وحدت کا پیغام دیا ہے۔قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی پیدائش ایک جان سے کی ہے پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس سے مردوں اور عورتوں ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔ (5) یہ بھی ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر مختلف قومیں اور خاندان بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کرسکو۔ (6)ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہے کہ ابتداء میں انسانوں کی ایک امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے۔ (7)

تیسرا اصول۔عبادت الٰہیہ میں وحدت کا پیغام:۔

اسلام نے عبادت الٰہیہ میں وحدت نسل انسانی کا درس دیا ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج عالمگیر انسانی مساوات، عملی وحدت اور اجتماعیت کے مظہر ہیں۔ یہی عبادات اسلامی معاشرہ کی بنیاد اور اساس ہیں۔

چوتھا اصول۔ قانونی وحدت:۔

اسلام قانونی وحدت اور مساوات کا داعی ہے۔ جرم وسزا میں کسی کیساتھ رعایت نہیں۔ قرآن مجید میں مومنین کو انصاف پر قائم رہنے اور اللہ تعالیٰ کو حاضر وناضر جان کر سچی گواہی دینے کی تاکید کی گئی ہے، خواہ اس میں

---

(1) القرآن، ۲۴: ۲۸

(2) صحیح المسلم، ج ۱، باب الغنمۃ، ص ۵۶

(3) القرآن، ۴: ۱۵۰۔

(4) ایضاً، ۴: ۱۵۰، ۱۵۱

(5) ایضاً، ۴: ۱

(6) ایضاً، ۴۹: ۱۳

(7) ایضاً، ۱۰: ۱۹

ذات، والدین یا دوسرے قریبی رشتہ دوروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ کیوں نہ ہو۔ (1) ایک اور جگہ عدل کو تقویٰ کی جان قرار دے کر دوست ودشمن سے یکساں طور پر عدل کرنیکی تلقین کی گئی ہے۔ (2) یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو(3) امام عادل کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن، جبکہ خدا کے سائے کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہیں ہوگا سات شخصیتوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک امام عادل ہوگا۔ (4)

پانچواں اصول۔ سیاسی وحدت:۔

اسلامی تعلیم کے مطابق اقتدار میں تمام لوگ شریک ہوتے ہیں، رئیس مملکت کا انتخاب عوام ہی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (5)

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے اہل کے سپرد کرو۔

اس آیت میں کوئی مخصوص طبقہ نہیں جس کو انتخاب کا حق دیا گیا ہے بلکہ سلطنت کے جملہ افراد کو حکم دیا گیا ہے۔ پھر منتخب صاحب امر کیلئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ عوام کے مشورہ کے مطابق کام کریں۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (6)

اور ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہے۔

فکر وعمل کے اعتبار سے اسلام کے ہیئت ترکیبی میں دو عناصر، توحید اور عدل زیادہ نمایاں ہیں، جو اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ عقیدہ توحید معاشرہ کی تشکیل کیلئے فکری ومعاشرتی وحدت اور افراد کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی اساس ہے۔ ایک الٰہ کی بنیاد پر قائم اسلامی معاشرہ درحقیقت نسلی، لسانی اور جغرفیائی تصورات سے بالاتر ایک توحیدی معاشرہ ہوتا ہے جس کو ''جسد واحد'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ (7) دوسرا عنصر عدل ہے جس کا ظہور عدل اجتماعی، انسانی مساوات، معاشی اور معاشرتی عدل وانصاف کی صورت میں ہوتا

---

(1) القرآن، ۴: ۱۳۵

(2) ایضاً، ۵: ۸

(3) ایضاً، ۴: ۸۵

(4) صحیح البخاری، کتاب المحاربین، باب فضل من ترک الفواحش، ص ۶۲۵

(5) القرآن، ۴: ۵۸

(6) القرآن، ۴۲: ۳۸۔

(7) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبھائم، ص ۲۵۹

ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرہ اخوت اسلامی (1) اور انسانی عدل وانصاف (2) کی بنیادوں پر قائم ہے، نوع بشر کو ''اعیال اللہ'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جبکہ حسن معاشرت، اعتدال اور میانہ روی، صداقت وامانت داری، ایثار وقربانی اسلامی معاشرہ کے نمایاں پہلو ہیں۔

(iii) مذاہب عالم میں ہندو مت قدیم ترین مذہب ہے، جبکہ ہندومعاشرہ میں موہنجوداڑوں کے قدیم ترین دراوڑی تہذیب کے اثرات تک پائے جاتے ہیں۔ قدیم ترین مذہب ہونے اور مخصوص نظریات وافکار کی بناء پر ہندومت میں وحدت اور ہم آہنگی کی بجائے کثرت وتنوع پایا جاتا ہے، جس کی فکری مثال بیک وقت لاتعداد معبودوں کی پرستش کا تصور اور عملی مثال طبقاتی تقسیم ہے۔ اسی طرح ہندومت کسی ایک خاص طرز فکر یا طرز زندگی کا نام نہیں بلکہ یہ قدیم دراوڑی آریائی اور یونانی افکار اور راہ وروش کا نام ہے۔ طبقاتی تقسیم کی بناء پر موکش یا نجات کی ایک اور متعین راہ نہیں بلکہ برہمن کیلئے ویدوں کی تعلیم وتعلم، کھشتریوں کیلئے میدان جنگ میں جان دینے سے سورگ ملتا ہے۔ البتہ ان تمام تر کثرت وتنوع کے باوجود تکوینی نظریہ ''وجودیت'' کو ہندومت کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے جس پر ''نظریہ کرم'' اور'' عقیدہ تناسخ '' کی عمارت استوار کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہندومت اپنے مخصوص نظریات اور طرز فکر کی بناء پر ایک غیر مشنری، نجی زندگی تک محدود اور جغرافیائی مذہب ہے، جس کے ماٰخذ ہند کے آریائی اور غیرآریائی اقوام ہیں۔ چونکہ ہندومت نجی زندگی اور ہندوؤں کی چار ذاتوں میں منقسم مخصوص معاشرتی زندگی محدود ہے اس لئے ہندو مت ہندو معاشرے کے ایک جز ہونے کے باوجود معاشرتی اساس نہیں ہے۔

چونکہ ہندومت کی تعلیمات سے نجی زندگی کیلئے راہنمائی تو مل سکتی ہے لیکن فرد ومعاشرے کے تمام تر زندگی پر حاوی نہیں ہے اس لئے ہندومت کسی بھی معاشرے کی اساس نہیں بن سکتی۔ لہٰذا ہندومعاشرے کی بنیاد مذہبی تعلیمات پر کم اور سماجی رسوم پر زیادہ ہے، جبکہ بسااوقات سماجی اور معاشرتی رسوم کو مذہبی تقدس دیا جاتا ہے۔ جس کی مثال ہندوؤں کی طبقاتی تقسیم ہے، جس کا رواج دنیا کے تمام متمدن اقوام میں پایا جاتا تھا، لیکن ہندوؤں میں اس کو مذہبی تقدس دے کر ہندو معاشرے کو ہمیشہ کیلئے ذات پات کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ ذات پات تقسیم کار کے اعتبار سے ایک معاشرتی رواج تھا، ہندومت میں اس کو نسلی اور پیدائشی برتری اور کمتری کا معیار بنا یا گیا۔ اس لئے ہندومعاشرہ میں وحدت اور یگانگت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ ایک طرز عمل معاشرے کے ایک طبقے کیلئے ذریعہ نجات جبکہ دوسرے طبقے کیلئے جرم

---

(1) القرآن، ۱۰:۴۹

(2) ایضاً، ۸:۵

اور قابل سزا تصور کیا جاتا ہے، مثلاً ویدوں کی تعلیم وتعلم برہمنوں کیلئے باعث نجات جبکہ شودروں کیلئے ایک ناقابل معافی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندومعاشرہ میں انسانی مساوات کی بجائے نسلی تفاخر اور پیدائشی برتری وکمتری کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے جس کے مطابق ہندوؤں کے علاوہ تمام نوع بشر کو ''چنڈال'' کہہ کر ان سے کسی قسم کے سماجی اور معاشرتی روابط نہیں رکھے جا سکتے ۔ ہندومعاشرہ میں رسوم ورواج کے اعتبار سے بھی کافی تنوع اور اختلاف پایا جا یا ہے۔مخصوص مذہبی رسوم کے ساتھ ساتھ علاقائی اور خاندانی رسوم پر عمل پیرا ہونے کی اجازت مذہب اور سماج دونوں کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس لئے ہندو معاشرہ میں عقائد وافکار اور عبادات سے لے کر سماجی ومعاشرتی رسوم اور نجی واجتماعی زندگی میں وحدت اور ہم آہنگی کا فقدان پایا جاتا ہے۔مختصر یہ کہ ہندومعاشرہ متنوع افکار، اورمختلف سماجی و معاشرتی رسوم کا حامل ہے۔

(iv) اسلامی تعلیمات نے عقیدہ وفکر کے اعتبار سے ہندی ذہن کو زیادہ متاثر کیا ہے جس کے نتیجے میں اسلام کے سادہ عقائد یہاں کے لوگوں میں سرایت کرگئے ہیں، جن کا اظہار دوطرح سے ہوا ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی عقائد اور نظام معاشرت سے متاثر ہوکر بہت سے افراد نے اسلام قبول کیااور یوں وہ اسلامی معاشرہ کے افراد بن گئے ہیں۔ اسلامی عقائد وتعلیمات کا دوسرا ظہور ان لوگوں کی صورت میں ہوا ہے جو ہندومت پر کاربند رہنے کے باوجود اسلامی تعلیمات سے متاثر ہیں، ان کے فکرعمل سے اسلامی تعلیمات کا اظہار ہوتا ہے، جن میں بھگت کبیر اور گورونانک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(v) جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے وہ اپنے اسلامی طرز فکر اور عمل کی وجہ سے ہندو معاشرے سے مختلف ہیں، جس کو برصغیر ہندو پاک کا مسلم معاشرہ کہا جا سکتا ہے ۔جن کے عبادات نماز روزہ اور حج وغیرہ کے طور طریقے تو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں۔لیکن سماجی اور معاشرتی رسوم پر ہندوانہ اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ سماجی رسوم یعنی پیدائش، شادی اور موت کی رسومات میں اسلامی اور ہندوانہ رواج کی امیزش نظر آتی ہے، جبکہ تہواروں اور قبروں پر جو عرس منعقد کئے جاتے ہیں ان کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یہ تمام تر ہندوسماج سے ماخوذ ہیں۔

(vi) مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اجزائے کے لحاظ سے عدل وتوحید پر مبنی ہے اور مذہب اسلام اس کا بنیادی عنصر ہے۔ اس کے تمام افراد اخوت اور بھائی چارے کے رشتے میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اسلامی معاشرہ عالمگیر اصولوں کا حامل اور جغرافیائی تصورات سے بالا تر انسانی مساوات کا علمبردار ہے۔ اس کے برعکس ہندو معاشرہ کی تشکیل میں بنیادی عنصر مذہب کی بجائے دوسرے عوامل، جغرافیائی حالات اور نسلی وخاندانی تصورات، اہم کردار رکھتے ہیں۔ اس لئے ہندو معاشرہ

ایک مذہبی نہیں بلکہ ایک لادینی معاشرہ ہے۔

(vii) برصغیر پاک وہند کا مسلم معاشرہ اسلامی اور ہندو تہذیب وتمدن اور فکر وعمل سے مرکب ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں فکری اور عقیدے کے لحاظ سے اسلامی فکر زیادہ واضح ہے۔ بنیادی عقائد، مثلاً توحید، رسالت اور آخرت اور عبادات، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ خالص اسلامی معاشرے کی بنیاد اور نمایاں عناصر ہیں۔ دوسری طرف سماجی اور معاشرتی زندگی میں اسلام کے سادہ اصول اور راہ وروش سے انحراف نظر آتا ہے اور بہت سے طور طریقے اور رسوم ورواج ہندو معاشرے سے لئے گئے ہیں۔ معاشرتی رسوم میں پیدائش سے لیکر موت رسوم ورواج، کھانے پینے، لباس اور رہن سہن کے طریقوں میں ہندوانہ طرز عمل زیادہ نمایاں ہے۔ فکری لحاظ سے تکوینی نظریات میں نظریہ وجودیت کی بنیاد ہندی فلسفہ پر استوار کی گئی ہے۔ تصوف کے بعض وظائف مثلاً حبس دم، اور چلہ معکوس وغیرہ بھی ہندو جوگیوں سے ماخوذ ہیں۔ اس کے علاوہ مزاروں اور قبروں پر میلوں، تہواروں اور عرس وغیرہ کا انعقاد خالص ہندوانہ طرز عمل ہے، جس کا رواج برصغیر پاک ہند کے مسلم معاشرے میں پایا جاتا ہے۔

(viii) برصغیر پاک وہند کے مسلم معاشرے میں سماجی اور معاشرتی رسوم ایک اہم عنصر ہے، جن کے دو بنیادی اسباب زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں کی مقامی آبادی اسلام کے اصولوں اور سادہ عقائد متاثر ضرور ہوئی جس کے نتیجے میں ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کیا، تاہم ہندو معاشرے کے ساتھ سماجی اور معاشرتی روابط کی بناء پر آبائی رسوم کی تقلید جاری رکھی گئی۔ دوسرا سبب یہ کہ برصغیر پاک وہند کے مسلم معاشرے کی تعلیم تربیت میں عقائد اور عبادات پر توجہ دی گئی تھی، اور اب بھی عقائد وعبادات ہی تعلیم وتربیت کے محور ومرکز سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن سماجی اور معاشرتی رسوم ورواج کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے آگاہی پر کم توجہ دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے عقائد وعبادات میں تو فرق وامتیاز قائم رکھا گیا ہے لیکن سماجی اور معاشرتی زندگی میں ہندوانہ رسوم ورواج پائے جاتے ہیں۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ عقائد وعبادات کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سماجی رسوم ورواج کے بارے میں آگاہی کو تعلیم وتربیت کا لازمی بنا دیا جائے تاکہ برصغیر پاک وہند کا مسلم معاشرہ صحیح معنوں میں اسلام کے معاشرتی اصولوں پر استوار ہوسکے۔ جس میں عبادات اور عقائد کے ساتھ ساتھ اسلام کے سادہ معاشرتی اور سماجی رسوم ورواج پر عمل کیا جاسکے۔

مراجع ومصادر

(اردو مصادر)

۱۔ ابن جوزی، جمال الدین ابوالفرج، حیات فاروق اعظم، ترجمہ وتعلیق، علامہ شاہ حسن عطاء، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۳ء۔

۲۔ ابن خلدون عبدالرحمٰن، (المغربی)، مقدمہ، مترجم مولانا سعد حسن خان یوسفی، نور محمد خان کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی، سن اشاعت نامعلوم۔

۳۔ ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ، مترجم علامہ وحیدالزمان، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور، ۱۹۹۰ء۔

۴۔ ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داؤد، اردو ترجمہ علامہ وحید الزمان، ضیاء احسان پبلیشرز نعمانی کتب خانہ لاہور، ۱۹۹۷ء

۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ: طبع اول: زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

۶۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الادب المفرد، اردو ترجمہ مولانا محمد خالد، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، ۱۹۹۷۔

۷۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، اردو ترجمہ مولانا سید عبدالدائم الجلالی، المکتبۃ العربیۃ، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۵ء۔

۸۔ امام مالک، مالک بن انس بن ابی عامر، موطا امام مالک، اردو ترجمہ علامہ وحید الزمان، اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور، ۱۴۰۲ھ۔

۹۔ امیر حمزہ، (مولانا)، ہندوؤں کا ہمدرد، دارلاندلس مرکز القادسیہ لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۱۰۔ آزاد، ابوالکلام، احمد (مولانا)، ترجمان القران، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیشرز لاہور، سن اشاعت نامعلوم۔

۱۱۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، (مولانا) مصباح اللغات، مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ انارکلی چوک لاہور، ۱۹۵۰ء۔

۱۲۔ تارا چند، (ڈاکٹر) تمدن ہند پر اسلامی اثرات: طبع دوم: مترجم مسعود احمد، مجلس ترقی ادب لا ہور، ۲۰۰۲ء۔

۱۳۔ ترپاٹھی، رما شنکر، تاریخ قدیم ہندوستان، مترجم سید سخی حسن نقوی: اشاعت سوم: بک سٹی پوائنٹ کتاب مارکیٹ لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۱۴۔ ترمذی، عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، مترجم مولانا بدیع الزمان، نعمانی کتب خانہ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۰ء۔

۱۵۔ تھانوی، اشرف علی، (مولانا) احکام اسلام عقل کی نظر میں، داراشاعت کراچی، ۱۹۷۷ء۔

۱۶۔ جاوید، قاضی، (پروفیسر)، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، نگارشات پبلیشرز لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۱۷۔ جلال پوری، علی عباس، رسوم اقوام، تخلیقات پبلیشرز، علی پلازہ مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۸۔ جلال پوری، علی عباس، روایات تمدن قدیم: اشاعت سوم: تخلیقات پبلیشرز، علی پلازہ مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۲ء

۱۹۔ جلال پوری، علی عباس، کائنات اور انسان، تخلیقات پبلیشرز، علی پلازہ مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۲۰۔ جھٹارام، جی۔ بی۔، معاشیات ہند، تخلیقات، مترجم مولوی رشید احمد، داراطبع جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن، ۱۹۴۰ء۔

۲۱۔ چانکیہ، کوٹلیہ، ارتھ شاستر، مترجم سلیم اختر، نگارشات پبلیشرز، مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۲۲۔ چیمہ، غلام رسول، چوہدری، (پروفیسر) اسلام کا عمرانی نظام، علم وعرفان پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۲۳۔ حسن، عبدالغفار، مسلم خاتون: حقوق، فرائض، اوصاف، رباط العلوم الاسلامیہ کراچی، ۱۹۹۳ء۔

۲۴۔ داس گپتا، ایس۔ این۔ ہسٹری آف انڈین فلاسفی، مترجم رائے شیوموہن لعل، دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن، ۱۹۴۵ء۔

۲۵۔ ڈیورانٹ، ول، تاریخ، تہذیب، تمدن، فلسفہ ہندوستان، مترجم طیب رشید، تخلیقات پبلیشرز، علی پلازہ لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۲۶۔ راگوزن، زیڈ۔ اے۔، (میڈم)، ویدک ہند، مترجم مولوی احمد انصاری، دارابطع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن، ۱۹۲۳ء۔

۲۷۔ رائے، بی۔ بی، (پروفیسر)، سمپر دائے، سچیت کتاب گھر اشرف مینشن، چوک گنگا کوئینز روڈلاہور، ۱۹۹۸ء۔

۲۸۔ رائے، لالہ لاجپت، آریہ سماج کی تاریخ: طبع اول: پرنٹ لائن پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۲۹۔ رشید احمد، مذاہب عالم، زمرد پبلی کیشن لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۳۰۔ روشن لعل، رائے، (ایم۔ اے)، بھگوت گیتا، : تشریح ووضاحت، نظر ثانی : یاسر جواد، فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۳۱۔ سپینگلر، اسوالڈ، زوال مغرب، مترجم منظور حسن ملک، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔

۳۲۔ سرسوتی، دیانند، (سوامی)، ستیارتھ پرکاش، مترجم رحمت حسین، الندر پریس میرٹھ ۱۹۸۹ء۔

۳۳۔ سرسوتی، سوامی دیانند، رگ وید: ایک مطالعہ، مترجم نہال سنگھ، نگارشات مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۵ء۔

۳۴۔ سعید احمد ایم۔ اے۔ (مولانا) الرق فی الاسلام یعنی اسلام میں غلامی کی حقیقت، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۳۵۷ھ۔

۳۵۔ سید احمد، ابطال غلامی، مطبع مفید عام، آگرہ ۱۸۹۳ء۔

۳۶۔ سید قطب (شہید)، اسلام میں عدل اجتماعی: اشاعت ششم: مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلامک پبلی کیشن لاہور، ۱۹۸۲ء۔

۳۷۔ شرما، رام شرن، (ڈاکٹر) قدیم ہندوستان میں شودر، مترجم جمال صدیقی، ادارہ روشنائی، سچیت گھر، اشرف مینشن لاہور، سن اشاعت نامعلوم۔

۳۸۔ شہاب، رفیع اللہ، (پروفیسر)، اسلامی معاشرہ، سنگ میل پبلی کیشن لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۳۹۔ صدیقی، عبدالرحمٰن، ارمغان جاوید، رحمان مارکیٹ لاہور، ۱۹۹۴ء۔

۴۰۔ طفیل، محمد، نقوش رسول نمبر، ج:۲ حکیم محمد نعیم الدین زبیری: خطبۃ الوداع: ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۸۲۔

۴۱۔ عبدالحئی، (ڈاکٹر) احکام میت، ادارۃ القرآن وعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۹۹۱ء۔

۴۲۔ عبدالرشید، (ڈاکٹر)، ادیان مذاہب کا تقابلی مطالعہ، طاہر سنز کراچی، ۱۹۹۶ء۔

۴۳۔ غازی، حامد الانصاری، (مولانا)، اسلام کا نظام حکومت: اشاعت سوم: مکتبۃ الحسن لاہور، سن اشاعت نامعلوم۔

۴۴۔ غزالی، امام، احیاءعلوم الدین، مترجم مولوی محمد حسن صدیقی، مقبول اکیڈمی لاہور، سن اشاعت نا معلوم۔

۴۵۔ غلام رسول ایم۔ اے، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، علمی کتب خانہ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۴۶۔ غلام علی خان، برصغیر میں اسلام اور دیگر مذاہب کی فکری کشمکش؛ ۱۸۰۰ء تا قیام پاکستان، ایک تحقیقی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور، ۲۰۰۰۔

۴۷۔ فاروقی، عمادالحسن، دنیا کے بڑے مذاہب، مکتبہ تعمیر انسانی، لاہور، سن اشاعت نامعلوم۔

۴۸۔ قادر، سی۔ اے، (ڈاکٹر)، معاشریات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۴ء۔

۴۹۔ کتاب مقدس یعنی پرانا اور نیا عہد نامہ، بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۵۰۔ کرامت حسین، مبادیات نفسیات، ایم۔ آر۔ برادرز، اردو بازار لاہور، ۱۹۵۱ء۔

۵۱۔ گنگوہی، محمد حنیف، (مولانا) الصبح النوری، اردو شرح مختصر القدوری، مکتبۃ الاشرافیہ لاہور، سن اشاعت نامعلوم۔

۵۲۔ گوری شنکر ھیرا، چند اوجھا، رائے بھادر مہا مہوپادھیائے، قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب، مترجم میر منشی پریم چند، ہندوستانی اکادمی یوپی، آلہ باد، ۱۹۳۱ء۔

۵۳۔ گیلانی، اسعد، (سید)، اسلامی تہذیب واقدار، فیروز سنز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۵۴۔ گیلانی، اسعد، (سید)، اسلامی طرز حیات، فیروز سنز لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۵۵۔ لیبان، گستاوَن باوَلی، تمدن ہند، مترجم سید مجتبیٰ علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۲ء۔

۵۶۔ لیبان، گستاوَن باوَلی، (ڈاکٹر)، روح الاجتماع: طبع دوم: مترجم مولانا محمد یونس انصاری، ادارۂ معارف اعظم گڑھ، ۱۹۲۶ء۔

۵۷۔ لینن، وی۔ آئی۔، ریاست اور انقلاب، جدجہد پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۵۸۔ مبارک علی، (ڈاکٹر) تاریخ اور معاشرہ: اشاعت دوم: فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۵۹۔ مصنف نامعلوم، پشتو ترجمہ افضل بنگش، دٹولنے ارتقاء، شاہین برقی پریس پشاور، ۱۹۷۷ء۔

۶۰۔ مطہری، آیات اللہ مرتضیٰ، (استاد) اسلامی تصور کائنات پر ایک تمہید، دفتر ثقافتی نمائندہ اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، سن اشاعت نامعلوم۔

۶۱۔ منو، منو دھرم شاستر، مترجم ارشد رازی، نگارشات پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۶۲۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، (مولانا) اسلامی ریاست: فلسفہ، نظام کار اور اصول حکمرانی، اسلامک پبلیکیشن لاہور، ۱۹۹۲ء۔

۶۳۔ مہا پتر، امولیہ رنجن، فلسفہ مذاہب، مترجم یاسر جواد، فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۱ء۔

۶۴۔ میکلیکن، ا۔ ی۔/ایچ۔ اے روز، پنجاب کے رسم ورواج کا انسائیکلو پیڈیا، مترجم یاسر جواد، بک ہوم لاہور، ۲۰۰۵ء

۶۵۔ نارائن، آر۔ کے۔، مہابھارت، مترجم نعیم احسن، نگارشات مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء۔

۶۶۔ ندوی، ابوالحسن علی (سید) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، سن اشاعت نامعلوم۔

۶۷۔ ندوی، سلیمان، (سید)، سیرۃ النبی ﷺ، دارلاشاعت اردو بازار کراچی، ۱۹۸۵ء۔

۶۸۔ ندوی، سلیمان، (سید)، عرب وہند تعلقات، ہندوستانی اکادمی یوپی، آلہ باد، ۱۹۳۰ء۔

۶۹۔ نعمانی، شبلی، الفاروق: طبع دوم: مالکان کتب خانہ صدیقیہ ملتان، سن اشاعت نامعلوم۔

۷۰۔ نہرو، جواہرلال، تلاش ہند، تخلیقات، علی پلازہ مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۴ء۔
۷۱۔ والمیکی، رامائن، مترجم، یاسر جواد: طبع سوم: فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۷۲۔ وجدی، محمد فرید، (مصری) المدینۃ والاسلام، مترجم: رشید احمد انصاری، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۰۴ء۔
۷۳۔ وحید الدین خان، (مولانا) دین وشریعت، دارالتذکیر اردو بازار لاہور، ۲۰۰۳ء۔

مصادر اللغة العربية

١. ابراهيم الامينى، نافذه علىٰ قضايا الاسلام، ترجمة كمال السيد موسسة انصاريان، الصدر، قم، ايران، ١٩٩٦ء.

٢. ابن اثير، عزالدين ابى الحسن على بن ابى الكرم محمد بن محمد بن الكريم، الكامل فى التاريخ، داربيروت للطباعة والنشر، ١٩٦٥ء.

٣. ابن حنبل، احمد، المسند للامام احمد بن حنبل، شرحهٗ ووضع فهارسهٗ بحمزة احمد اللدين: اطبعة الاولىٰ :دارلحديث ا؛قاهرة، ١٩٩٥.

٤. ابن كثير، عمادالدين ابى الفداء اسماعيل بن عمر، جامع المسانيد واسنن الهادى الاقوام السنن، دارالفكر للطباعة والنشروالتوريع، ١٩٩٤ء.

٥. ابن منظور، ابى الفضل جمال الدين محمد بن مكرم، لسان العرب، داربيروت للطباعة والنشر١٩٧٤ء.

٦. ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعيب النسائى، سننى نسائى، المكتبة السلفية لا هور، باكستان.

٧. ابى بكر احمد بن الحسين بن على البهيقى، معرفة السنن والاثار عن الامام ابى عبدالله محمد بن ادريس الشافعى، مخرج على التربيب مختصر ابى ابراهيم اسماعيل بن يحىٰ المزنى :الطبعة الاولىٰ :دارلكتب العلمية بيروت، لبنان، ١٩٩١ء.

٨. احسن ابراهيم حسن، (الدكتور)، تاريخ الاسلام السياسى، والدين، والاجتماعى: اطبعة السابع:مكتبة النهصة لاصحابها حسن محمد والادهٗ، قاهرة، ١٩٦٤ء.

٩. الاورى، آدم عبدالله، تاريخ الدعوة الى الله بين الامس واليوم، مكتبة وهبة، شارع الجمهورية، عابدين القاهرة، ١٩٨٨ء.

١٠. الباقى، محمد فئواد، المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الكريم: الطبعة دوم: انتشارات اسلامى طهران، ايران، ٥١٣٧٢

١١. البلاذرى، ابوالحسن احمد بن يحىٰ، فتوح البلدان، منشورات الارومية قم ايران، ٥١٤٠٤.

١٢. الجوزى، حافظ عبدالرحمٰن بن على، احكام النساء، دارالكتب العلمية بيروت، ١٩٩٢ء.

١٣. العسقلانى، حافظ بن على حجر، فتح البارى فى شرح البخارى، المطبعة السلفية باالروضة، قاهرة، ١٩٦٤ء.

۱۴. القرآن الکریم

۱۵. القرطبی، ابی عبدالله محمد بن احمد الانصاری، احکام القرآن، انتشارات ناصر خصرو، طهران، ایران، ۱۳۸۴ھ.

۱۶. النسفی، ابی البرکات عبدالله بن احمد بن محمود، المدارك التنزیل وحقائق التاویل، تاج محل کمپنی قصه خوانی بشاور، باکستان، سن اشاعت نامعلوم.

۱۷. امام مسلم، الصحیح المسلم ومع شرحهٔ الکامل للنواوی، قدیمی کتب خانه مقابل آرام باغ کراچی، ۱۹۵۸ء.

۱۸. اے. جے. ونسنك، (الدکتور)(Dr.A.J.Wensinck) معجم المفهرس لالفاظ حدیث، مکتبة بریل لیدن، ۱۹۴۶ء.

۱۹. جو ستاف لوبون، الدکتور، سر تطور الامم، ترجمة من اللغة الفرنساویه، احمد فتحی زغول پاشا، مکتبة رحمانیة قاهرة، ۱۹۲۱ء.

۲۰. شبلی، احمد، ادیان اهند الکبریٰ :الطبعة الثالثة:قاهرة، ۱۹۹۴ء.

۲۱. شلبی، رؤف، (الدکتور)، الادیان القدیمه فی الشرق، بیروت، ۱۹۹۲ء.

۲۲. شهرستانی، ابوالفتح محمد بن عبدالکریم، کتاب الملل والنحل، تخریج محمد بن فتح الله بدران:اطبعة الثالثة :مکتبة الانجلوالمصریة القاهرة، ۱۳۰۲ھ.

۲۳. علاوالدین، علی المتقی بن حسام الدین الهندی البرهان، کنزالعمال فی السنن والاقوال والافعال، موسة الرسالة، بیروت، ۱۹۸۹ء.

۲۴. وجدی، محمد فرید، دائرة المعارف القرآن، دائرة معارف القرآن العشرین، ۱۹۲۳ء.

BIBLIOGRAPHY.

1. Aasi, Ghulam Haider. Muslim Understanding of other Religions, Islamabad: International Institute of Islamic Thought and Islamic Research, 1999.
2. AmirAli, Syed. The Spirit of Islam, Karachi: Pakistan Publishing House, 1984.
3. Apastamba, Apastamba's Grihya Sutra, Translated by Herman Oldenberg and Motilal Banarisdass, Delhi, 1981.
4. Apastamba, Yagna - Parisbhasha, Translated by Herman Oldenberg and Motilal Banarisdass, Delhi, 1981.
5. Askari, Hassan, Society And State In Islam: An Introduction, Lahore: Progressive Books Urdu Bazaar, 1979.
6. Asvalayana and Saunaka, Asvalayana - Grihya Sutra, Translated by Herman Oldenberg and Motilal Banarisdass, Delhi, 1981.
7. Bloomfield, Maurice. Hymes of The Athra Veda, Sacred Books of The East, vol:42; 1897. (www.sacred-text-Hinduism.com)
8. Cal Pham, J. H. An Economic History of Modern Britain, London: Cambridge, 1930.
9. Candler, Alfred D. Industrial Revolution: Arrangement, Bulletin of the American Academy of Arts and Science, Vol: 14, May 1980.
10. Capes, Walter H. Ways of Understanding of Religion, New York: The Macmillan Company, 1972.
11. Childe, V. Gordon, Man Makes Himself, New York: Mentor, 1953.
12. Childe, V. Gordon, What Happened In History, Baltimore: Penguin, 1964.
13. Dubois, Abbee J. A. Hindu Manners, Customs and Ceremonies, Edi:3rd : Translated by Henry k; Beauchamp, London: Oxford University Press, 1924.
14. Durant, Will, The Story of Civilization; Part 1, New York: Simon and Schuster, 1954.

15. Fani, Mohsan, Dabistan-e-Mazahib (School of Religions) Translate by David Shea and Anthony Troyer, Lahore: Triple Stars Printing Press, 1973.

16. Frazer, J. G. Golden Bough, Ptv. 1903.

17. Fritz, Walter, Concept of Society, New Horizon Press, (www.sacred-text-Hinduism.com)

18. Ganguli, Kisari Mohan, The Maha Bharatha, 1896 (www. sacred-text-Hinduism.com)

19. Gibb, H. A. R. and Harold Bowen, Islamic Society and The West, Vol: 1, Par:2, London: Oxford University Press, 1957.

20. Gobhila, Gobhila-Grihya-Sutra, Translated by Herman Oldenburg and Motilal Banarisdass, Delhi, 1981.

21. Griffith, Ralph T. H., Hymes of The Sama Veda, 1895, (www.sacred-text-Hinduism. corn)

22. Griffith, Ralph T. H., The RegVeda, 1986. (www.sacred-text-Hinduism.com)

23. Hameedullah, Muhammad, The Muslim Conduct of State, Lahore: Sh. Muhammad Ashraf Publishers, 1987.

24. Harlan, Jack, The Plant and the Animals that Nourish the man, Scientific American, vol: 235, September, 1976.

25. Harris, Marvin. The Rise of Anthropological Theories, New York: Crowell, 1968.

26. Hasting James, Encyclopedia of Religion and Ethics. Edinburgh: T. & T. Clark, 38 George Street, 1915.

27. Hews, Gordon. The Rubric: Fishing and Fisheries, American Anthropologist, Vol: 50, 1948.

28. Hirvanyakesin, Hirvanyakesin - Grihya Sutra, Translated by Hermann Oldenberg, Delhi: Motilal Banarsidass, 1981.

29. Iqbal, Afzal, The Culture of Islam, Edi:1st , Lahore: Institute of Islamic Culture, 1967.

30. Iqbal, Muhammad, Dr. Reconstruction of Religious Thought in Islam. Edited and Annotated by M. Saeed Shiekh Edi: 4th ; Lahore: Institute of Islamic Culture, 1999.

31. James, E. O. Comparative Religion, London: University Paper Backs, 1961.